AUGUST
2023

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

نم
کبیر اطہر

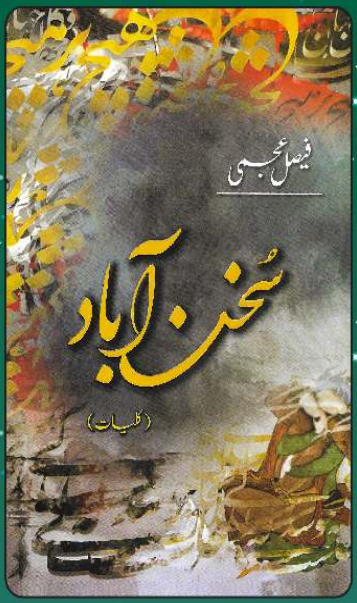
فیصل عجمی
سخن آباد
(کلیات)

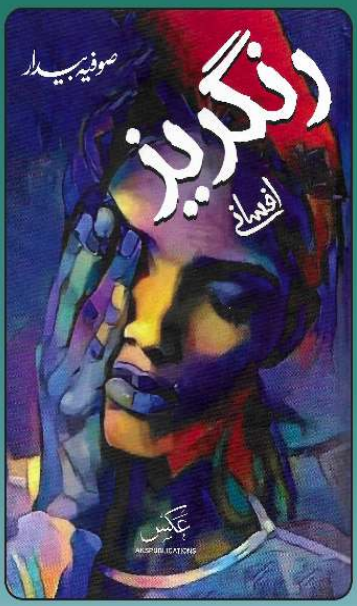
صوفیہ بیدار
رنگریز
افسانے
عکس
PUBLICATIONS

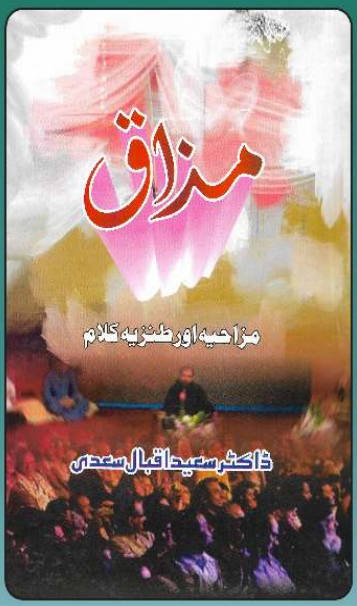
مذاق
مزاحیہ اور طنزیہ کلام
ڈاکٹر سید اقبال سعدی

غزل

کیوں قیس کو وہ دشت بسانے نہیں دیتے
منصور کو جو شہر میں آنے نہیں دیتے

اس شہر کی ان بھول بھلیّوں کی پہیلی
ہم بوجھ بھی لیں تو وہ بتانے نہیں دیتے

ہم لوگ اُداسی میں بھی ثانی نہیں رکھتے
آزردہ دِلوں کو اِدھر آنے نہیں دیتے

ہر صبح نئے رُخ سے نکلتا ہے یہ سورج
وہ نام بھی ظالم کا بتانے نہیں دیتے

نفرت کو اُن آنکھوں سے چھلکنا نہیں آتا
ہم لوگ بھی ماتھے پہ بل آنے نہیں دیتے

کس رنگ شب و روز گزرتے رہے خالد
وہ پوچھ تو لیتے ہیں بتانے نہیں دیتے

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 36363300-7
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5606565 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جمہور ادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 31 - اگست 2023 - شمارہ نمبر: 8

ایڈیٹر: عمران منظور

مجلس ادارت

اعجاز رضوی	نعمان منظور	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: یومِ آزادی مبارک

قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں

فیصل بینک لمیٹڈ

ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی لاہور

اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور- 53700

فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ www.trackntie.com BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر پبلشر و پرنٹر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر ملتان روڈ سید اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	خالد علیم، اویس الحسن	7 تا 8
2	نعت	جلیل عالی، سید ریاض حسین زیدی، خاور اعجاز، محمد انیس انصاری نسیم سحر، محمد یٰسین قمر، دانش عزیز، ریاض ندیم نیازی اشرف نقوی، اعجاز دانش	9 تا 18
3	عقیدت	مرزا آصف رسول	19 تا 20
4	سلام	خالد احمد، خالدہ انور، احمد جلیل، دانش عزیز، سرور حسین نقشبندی فیض رسول فیضان، محمد شفیق انصاری، رضا اللہ حیدر ساجد رضا خان، محمد اشفاق بیگ، طلحہ غفور، خالق آرزو	21 تا 32
5	رباعیات	گلزار بخاری، خالد علیم	33 تا 34
6	قطعات	عاصم بخاری	35
7	ہائیکوز	خاور اعجاز	36
8	مضامین	فرحت عباس شاہ، نسیم سحر، محمد نوید مرزا، نبیل احمد نبیل سید بصیر الحسن وفا نقوی، اکمل حنیف، صدام ساگر رانا محمد شاہد، نعمان منظور	37 تا 75
9	آپ بیتی	شوکت علی شاہ	76 تا 83
10	شاعرِ امروز	آرب ہاشمی [شاہد ماکلی]	84 تا 85
11	غزلیں	خالد احمد، جلیل عالی، سید ریاض حسین زیدی، انور شعور، اعجاز کنور راجہ نسیم سحر، محمد انیس انصاری، راحت سرحدی، گلزار بخاری	86 تا 180

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
11	غزلیں	صفدر صدیق رضی، خاور اعجاز، قیوم طاہر، اکرم ناصر، اقبال سرویہ طالب انصاری، باقی احمد پوری، سعد اللہ شاہ، تابش کمال، محمد سلیم سہ گر نوید صادق، مسعود احمد، اویس الحسن، شفیق احمد خان، مینو محسن افتخار شاہد، ہمایوں پرویز شاہد، اکرم سحر فارانی، دانش عزیز شاہد کلی، حسنین سحر، اشرف کمال، رخشندہ نوید، خالدہ انور نیلم احمد بشیر، افتخار شوکت، اصغر علی بلوچ، مرزا سکندر بیگ ذکی طارق، فیض رسول فیضان، ظہور چوہان، سرور فرحان وسیم جہان، سید ضیا حسین، ثمینہ سید، اکرم جاذب، نبیل احمد نبیل عاطف جاوید عاطف، اعجاز دانش، شوکت محمود شوکت، عاصم اعجاز بشیر احمد حبیب، واصف سجاد، اعجاز روشن، اشرف نقوی، محمد نوید مرزا عقیل رحمانی، محمود کیفی، رانا سعید دوشی، انور حسن، رضا اللہ حیدر سعدیہ بشیر، فیصل زمان چشتی، صغیر احمد صغیر، عاصم بخاری راجہ عبدالقیوم، اکمل حنیف، محمد افضال انجم، کوکی گل، منزہ سحر محمد اشفاق بیگ، تقلین جعفری، رانا غلام محی الدین، علمدار حسین شکیل ارمان، مظہر حسین مظہر، امجد بابر، عائشہ ظفر، عابد معروف مغل تاثیر جعفری، اسد رضا سحر، محمد نور آسی، رخسانہ سمن، نائلہ راٹھور سید تیمور کاظمی، عزیز عادل، محمد علی ایاز، عنبرین خان، مہر علی عزیز قدیر مغل، فخر عظیم، ساجد رضا خان، منیر جعفری، زاہد خان غلام شبیر اسد، محمد بلال حسن، محسن جامی، علی آرش، عمر فدا، رضوان رضی	86 تا 180
12	افسانے	پیروز بخت قاضی، نیلم احمد بشیر، کلیم خارجی، صوفیہ بیدار، خالد ندیم شانی	181 تا 211
13	طنز و مزاح / خاکے	علی حسین اویس، اعجاز رضوی	212 تا 216
14	نظمیں	جلیل عالی، نسیم سحر، خاور اعجاز، فرخندہ شمیم، شفیق احمد خان اویس الحسن، ریاض ندیم نیازی، سید خالد یزدانی، شاہین عباس ثمینہ سید، سردر حسین نقشبندی، زعیم رشید، عاطف جاوید عاطف، محمد کلیم رفعت وحید، امجد بابر، اقبال خان یوسف زئی، یاسر فاروقی، نائلہ راٹھور لیلیٰ رباب، غلام مرتضیٰ، عاصم بخاری، سید تیمور کاظمی، اعجاز رضوی	217 تا 241

حمد

جو تیری حمد کو ہو خوش رقم، کہاں سے آئے
وہ روشنائی، وہ نوکِ قلم کہاں سے آئے

گناہ گار ہوں اے میرے مہربان خدا!
اگر گناہ نہ ہوں، چشمِ نم کہاں سے آئے

اگر نہ تارِ نفس کا ہو سلسلہ تجھ سے
یہ مجھ سے خاک نژادوں میں دم کہاں سے آئے

تری رضا سے علاوہ، تری عطا کے بغیر
بدن میں طاقتِ رفتار و رَم کہاں سے آئے

ترے کرم کے ترشّح بغیر دھوپ میں بھی
ہَوا میں تازگیِ نم بہ نم کہاں سے آئے

رجوعِ خیر بھی تیرے کرم سے ممکن ہے
کرم نہ ہو تو یہ کارِ اہم کہاں سے آئے

لرز رہا ہے مدوّر زمیں کا سینۂ سنگ
جو تُو نہ چاہے، ثباتِ قدم کہاں سے آئے

سحاب اٹھتے ہوئے ریگِ خشکِ صحرا سے
جو تُو نہیں ہے تو پھر یم بہ یم کہاں سے آئے

ترے بغیر کسی خیر و شر کے معرکے میں
کوئی کشاکشِ دیر و حرم کہاں سے آئے

حدوث میں بھی ہے تیری صدائے کُن فیکُوں
جو یہ نہ ہو، ترا رنگِ قِدَم کہاں سے آئے

تمام حادثۂ کائنات تجھ سے ہے
ترے بغیر عناصر میں رَم کہاں سے آئے

تمام نفی و اثبات کا بھرم تجھ سے
اگر وجود نہ ہو تو عدم کہاں سے آئے

ترے ثبوتِ ازل تاب سے ہوں میں موجود
وگرنہ ہونے کا یہ کیف و کم کہاں سے آئے

چھڑا ہے تجھ سے ہی تفریق و جمع و ضرب کا ساز
اگر نہ ہو کوئی اوّل، دُوم کہاں سے آئے

جزا سزا کا یہ سارا نظامِ کہنہ و نو
بتا رہا ہے یہ خالد کہ ہم کہاں سے آئے

خالد علیم

حمد

تو خدائے عزّ و کمال ہے، میں حقیر ہوں، میں فقیر ہوں
تیری مثل ہے نہ مثال ہے، میں حقیر ہوں، میں فقیر ہوں

تو عظیم ہے، تری خلق ہوں، یہی کم نہیں ہے مرے لیے
میری جاں خوشی سے نہال ہے، میں حقیر ہوں، میں فقیر ہوں

تری رحمتوں کو نہیں روا، جلے نام لیوا کوئی ترا
تو خدائے لطف و جمال ہے، میں حقیر ہوں، میں فقیر ہوں

یہ عجیب عالمِ کیف کے مجھے درمیاں ہے رکھا گیا
نہ فراق ہے نہ وصال ہے، میں حقیر ہوں، میں فقیر ہوں

مری بے اثر وہ دُعا نہ ہو، ترے رحم کو جو صدائیں دے
میرے واسطوں میں بلالؓ ہے، میں حقیر ہوں، میں فقیر ہوں

ہوں گناہگار تو کیا نہیں ہوں میں لائقِ کرم و عطا؟
مرے عجز کا یہ سوال ہے، میں حقیر ہوں، میں فقیر ہوں

مجھے دی ہیں تو نے بصارتیں تو بصیرتیں بھی نواز دے
تو کریم ہے، تو کمال ہے، میں حقیر ہوں، میں فقیر ہوں

اویس الحسن

نعتؐ

نصیب جس سے ضیا یاب خاص و عام کا ہے
تمام فیض اُسیؐ ماہِ دل مقام کا ہے

نظر سے گم نہیں ہوتا نشانِ منزلِ خواب
یہ سب کمال فقط اک جمالِ تام کا ہے

اسی کے واسطے تخلیقِ کائنات ہوئی
وہی تو اصل سبب سارے اہتمام کا ہے

کبھی قضا نہیں ہوتی دلوں سے یاد اُسؐ کی
وہیؐ وظیفہ و ورد اپنے صبح و شام کا ہے

اُسی ستارۂ سیرت سے رہ پہ آئے گا
جو بے جہت سفر اِس عہدِ کج خرام کا ہے

خوشی کی رُت کو بھی منسوب اُسیؐ سے کرتے ہیں
غموں سے بھی سہارا اُسیؐ کے نام کا ہے

سرِ صفات ہے سب سے فزوں مقام اُسؐ کا
رہِ حیات میں رہبر وہ گام گام کا ہے

جلیل عالی

نعتؐ

آنکھوں میں سجا، دل میں بسا، روح میں اترا
سو جان سے پیارا ہے مجھے گنبد خضریٰ

دنیا کی چکا چوند نے تاریک کیا تھا
روشن ہے خوشا! دیدۂ و دل میں شب اسرا

میرے رگ و ریشہ میں شفق پھوٹ رہی ہے
ہے یادِ نبیؐ دل میں مرے انجمن آرا

ایمان و یقیں کا سروسامان ہوا ہے
انسان جو ہر سمت تھا ٹوٹا ہوا بکھرا

ہر غیر خدا کے ہوئی چنگل سے رہائی
اوہام کا ورنہ دل انساں کو تھا خطرہ

قطروں نے سمندر سے لیا تابہ کراں روپ
ذروں نے چمک کر کیا ہر آنکھ کو خیرا

پل بھر میں اندھیروں کے قدم ڈول رہے تھے
یوں ماہِ عرب، مطلع انوار پہ ابھرا

بے حال کو ملتا ہے سکوں آپؐ کے دم سے
ہیں لرزہ براندام یہاں، قیصر و کسریٰ

ہر راز نہاں اس پہ عیاں ہوتا گیا ہے
جس کی نگہ و قلب میں ہے عظمت اقرا

ہو چشم کرم آپؐ کی جس پر مرے آقا!
کنکر ہو تو اک آن میں بن جاتا ہے ہیرا

کام آئے ریاض آج مری نعت سرائی
ہو جائے ضیا بار، مری ہر شب تیرا

سید ریاض حسین زیدی

نعت

لے چل ہوائے طیبہ تُو ملکِ عرب مجھے
رہنا نہیں ہے اور کہیں پر بھی اَب مجھے

مَیں ہُوں اور آستانِ محمدؐ کی رونقیں
کس چیز کی ہو اور زمیں پر طلب مجھے

آقاؐ ترے وسیلے سے پہچانا جاؤں مَیں
ویسے تو اَب بھی جانتا ہے میرا رَب مجھے

اِک بار چھُو تو آیا ہُوں روضے کی جالیاں
دیکھیں دوبارہ مِلتا ہے یہ اذن کب مجھے

ہو جائے آپؐ کا مجھے دیدار ایک بار
مِل جائیں زندگی کی تمنائیں سب مجھے

چلتا ہو جیسے قافلہ دِل میں حجاز کا
آتی ہے اِک صدائے جرس روز و شب مجھے

مولا ! مرے حروف کو تکریم سے نواز
آتا نہیں ہے نعت کا وصف و ادب مجھے

خاور اعجاز

نعتؐ

کٹ جائے گی جیون کی سیہ رات کسی دن
ہو جائے گی آقاؐ سے ملاقات کسی دن

آئے گا مدینے سے ہوا کا کوئی جھونکا
مہکیں گے دل و جاں کے مضافات کسی دن

کاسہ لیے بیٹھے ہیں مدینے کے گداگر
بانٹیں گے فقیروں میں وہ خیرات کسی دن

آنکھوں میں سما جائے گا وہ چہرۂ انور
بن جائے گی ہم ایسوں کی بھی بات کسی دن

روئیں گے کبھی سینۂ اقدس سے لپٹ کر
برسے گی عجب ڈھنگ سے برسات کسی دن

آقاؐ کی محبت مری مٹی میں رچی ہے
خورشید بنیں گے مرے ذرّات کسی دن

گردش میں ہو پھر دودھ کا پیالہ سرِ مجلس
لوٹ آئے وہی دورِ عنایات کسی دن

پائیں گے انیسِ دل و جاناں کو مقابل
اُٹھ جائیں گے آنکھوں سے حجابات کسی دن

محمد انیس انصاری

نعتؐ

ہے کیسا معجزہ اسمِ نبیؐ کا!
کہ گھر روشن ہؤا ہے مدحتی کا

درِ آقاؐ پہ میری حاضری کا
عجب لمحہ تھا وہ خوش قسمتی کا

ہوئی مجھ پر خُدا کی مہربانی
کہ اُس نے کر دیا مجھ کو نبیؐ کا

مدینے کی طرف جانا ہے مُجھ کو
"تعاقب کر رہا ہوں روشنی کا"

تسلسل اب بھی ہے کون و مکاں میں
وہی غارِ حرا کی روشنی کا

مِرے آقاؐ، بہت بھٹکا ہؤا ہوں
مگر مَیں ہوں سدا سے آپؐ ہی کا !

بڑا ویران ہوتا جا رہا ہوں
دوبارہ اذن دیجے حاضری کا

مِری آنکھوں میں روشن ہے ابھی تک
ہر اِک منظر وہاں کی ہر گلی کا

نسیمِ سحر

نعتؐ

مُشکبو اس لیے اتنا ہے صبا کا دامن
چوم کر آئی ہے محبوبِ خدا کا دامن

نور ہی نور ہے قرطاس و قلم پر میرے
ہاتھ میں جب سے ہے توصیف و ثنا کا دامن

جس کی سوچوں میں مسلسل ہو نبی کی سیرت
چھوڑ سکتا ہے بھلا کب وہ حیا کا دامن

اُن کے صدقے ہو عطا صدق و صفا کی دولت
جن کی نسبت سے مہکتا ہے صفا کا دامن

اُن کی دہلیز ہے الطاف و کرم ہے اُن کا
پھیلتا جاتا ہے اب میری دعا کا دامن

جب سے دمساز ہوئی رحمت و رافت اُنؐ کی
مدحت آثار ہوا نطق و نوا کا دامن

اُن کی نسبت ہی بنی اب تو حوالہ میرا
بھر گیا اُن کی عنایت سے گدا کا دامن

مُشکبار آپ کے انفاس سے اب بھی ہے قمرؔ
وادیِ کوہِ اُحد ثور و حرا کا دامن

محمد یٰسین قمر

نعتؐ

درِ اَحمدؐ پہ کوئی جا کے اگر بیٹھتا ہے
اُس کے لہجے میں عقیدت کا ثمر بیٹھتا ہے

کرنا پڑتا ہے شب و روز کسی اِسم کا وِرد
یونہی حسّان سا کب نُطقِ ہُنر بیٹھتا ہے

مُشکِ عنبر کی مہک اُٹھتی ہے چاروں جانب
اُنؐ کی دہلیز پہ جب دِیدۂ تر بیٹھتا ہے

اِس لیے تیز ہوائیں مرا کرتی ہیں طواف
مجھ سا ناقص بھی اگر تھام کے دَر بیٹھتا ہے

مجھکو صحرائے عرب سے کوئی دیتا ہے صدا
جب مرے ذِہن میں بطحہ کا سفر بیٹھتا ہے

یاد کرتا ہوں میں غزواتِ محمدؐ اُس دم
کسی دشمن کا اگر ذہن میں ڈر بیٹھتا ہے

نام ہوتا ہے غلامانِ محمدؐ میں اُدھر
مُعتکف ہو کے جو مجھ ایسا اِدھر بیٹھتا ہے

مجھ سے مت پوچھ مدینے کا تقدس دانش
یہاں جبریلِ امیں ڈھانپ کے پَر بیٹھتا ہے

دانش عزیز

نعتؐ

جہاں میں اُنؐ کی طرح خوش خصال کوئی نہیں
وہ بے مثال ہیں اُنؐ کی مثال کوئی نہیں

مدینے پاک میں جو بھی گیا خدا کی قسم
وہ خوش نصیب ہے اُس سا نہال کوئی نہیں

یوں آفتاب و قمر کہہ رہے ہیں، اُنؐ جیسا
حَسین کوئی نہیں پُر جمال کوئی نہیں

ہر ایک بات محمدؐ کی کر رہی ہے اثر
جہاں میں آپؐ سا شیریں مقال کوئی نہیں

نہیں ہے دوسرا کوئی جو چاند کو توڑے
ہُنر میں اُنؐ کی طرح باکمال کوئی نہیں

بدل دیئے ہیں محمدؐ نے رُخ ہواؤں کے
مرے حضورؐ سا روشن خیال کوئی نہیں

حضورؐ آئے تو شاداب ہو گئے صحرا
کہ آپؐ سا تو یہاں نیک فال کوئی نہیں

حَسنؓ کہ فاطمہؓ یا ہوں حُسین ابنِ علیؓ
نبیؐ کی آل کے جیسی تو کوئی آل نہیں

ریاض ندیم نیازی

نعتیہ

کُن کی حضورؐ! ساری کہانی ہے آپؐ سے
دریائے زندگی میں روانی ہے آپؐ سے

صبحِ ازل کا آپؐ ہی تھے نورِ اوّلیں
گو ظاہراً یہ دُنیا پرانی ہے آپؐ سے

ہم کو خدا سے آپؐ نے ہی آشنائی دی
پہچانی ہم نے رب کی نشانی ہے آپؐ سے

ہر آئینے کو آپؐ سے حیرت ہوئی عطا
اور عکس پر بھی آقاؐ جوانی ہے آپؐ سے

میرے سُخن کو آپؐ نے تاثیر بخش دی
پُر سوز میرا لفظ و معانی ہے آپؐ سے

آقاؐ! فقط میں آپؐ ہی کے در کا ہوں گدا
سو بھیک جو بھی چاہیے، پانی ہے آپؐ سے

دامن بروزِ حشر نہ چھوڑوں گا آپؐ کا
بخشش حضورؐ! میں نے کرانی ہے آپؐ سے

جب تک نہ آپؐ آئے تھے، بے کیف زیست تھی
صبح و مسا حیات سُہانی ہے آپؐ سے

اشرف ہے آقاؐ! تیرہ شبی میں گھرا ہوا
اِس نے تجلی نور کی پانی ہے آپؐ سے

اشرف نقوی

نعتؐ

اے ربِ کائنات! مدینے میں بیٹھ کر
گزرے مری حیات مدینے میں بیٹھ کر

مدحت لکھوں میں آپؐ کی، روضے کے روبرو
بن جائے میری بات مدینے میں بیٹھ کر

کب تک رہوں بھٹکتا زمانے میں بے طرح
پا جاؤں اب ثبات مدینے میں بیٹھ کر

طیبہ کی سرزمین پہ ہر دن ہے روزِ عید
ہر شب ہے شبِ برات مدینے میں بیٹھ کر

مجھ کو بھی اے خدا یہ سعادت نصیب ہو
لکھوں میں انؐ کی نعت مدینے میں بیٹھ کر

اس سرزمینِ پاک کا ہر دم ہو احترام
ہر پل ہو احتیاط مدینے میں بیٹھ کر

دانش! مری دعا ہے رسولؐ انام کی
ہو مجھ پہ التفات مدینے میں بیٹھ کر

اعجاز دانش

نصابِ عشق

ہے ربِ کعبہ کا حق معتبر مدینے میں
گھر اُس کا مکہ میں ہے اور در مدینے میں

یہ عشق سوئے حرم ہے وہ طائرِ لاہوت
کہ جس کو بخشے گئے بال و پر مدینے میں

ہے جس کے سایۂ رحمت کا ہر اُقف ممنوں
ہے وہ مبارک و طیب شجر مدینے میں

سخن سرا ہوں اس امید پر کہ میری بھی
کُھلے گی قسمتِ فکر و ہنر مدینے میں

زباں ہو گنگ اور اشکوں میں سب بیاں ہو جائے
ملے نوا کو وہ کیف و اثر مدینے میں

دعا تھی جس کی نمو کی کہ ربنا وابعث !
وہ نخلِ خلد ہوا بارور مدینے میں

نثار اُن کی اخوت پہ ہر گماں کہ جنھیں
یقیں نے دیکھا ہے شیر و شکر مدینے میں

وہ دشتِ زیست میں بکھرے ہوئے خزف ریزے
سب آ کے ہو گئے لعل و گُہر مدینے میں

ملے پھر اُمتِ مرحوم کو وجود ایسا
رہیں بہ فضلِ خدا چشم و سر مدینے میں

مزید لطف سرِ اھدنا الصراط ہے کیا
کہ با مراد ہوں راہ و سفر مدینے میں

بشر خلیفۂ ارضِ فساد رہ جاتا
نہ ہوتا خیر جہاں ساز اگر مدینے میں

سنو تو اب بھی ہے شاہد لا غلبن انا
ہے دیں کا پرچم فتح و ظفر مدینے میں

مرزا آصف رسول

اُسی کو تیغِ بلا سے ملی امان، اے دل!
کہ جس نے ڈال دی آ کے سپر مدینے میں

یہ حج و عمرہ یہ سعی و طواف اپنی جگہ
نصابِ عشق ہے کامل مگر مدینے میں

ندائے عام ہے لا تجھروا لہ بالقول
نہیں قبول کوئی کرّ و فر مدینے میں

ہے رحمت اُن کی تو سب کے لیے بلا تفریق
بس اپنے آپ سے لگتا ہے ڈر مدینے میں

ہے جس کے نور کی خاطر یہ بزمِ کن فیکون
زہے کرم! ہے وہ خیر البشر مدینے میں

میں کُوئے طیبہ میں ہو جاؤں گم تو پھر آصف!
ملے نہ مجھ کو بھی میری خبر مدینے میں

بجناب امام عالی مقام علیہ السلام

مدّاحِ شبیرؑ میں آغازِ سخن ہے
اجماعِ شرف آج سرِ برجِ دہن ہے

لب ہیں کہ دوپارہ صدفِ صبحِ چمن ہے
وہ چال ہے یا حسنِ محبت کا چلن ہے

تن ہے کہ مہ و مہرِ مجلل ہوں اُسے دیکھے
چہرہ ، سببِ زینت و زیبائشِ تن ہے

ہم رنگِ سحر ہے، وہ مہِ شامِ غریباں
ہم چشمِ غزالانِ بیابانِ ختن ہے

اَبرو ہیں کہ قوسین پہ قوسین دھرے ہیں
پلکیں ہیں کہ آنکھوں پہ حیا ابر فگن ہے

توصیف کرے اصغرؑ و اکبرؑ کی وہ کیسے؟
زینب کے لیے ایک حسینؑ، ایک حسنؑ ہے

ہر مسلکِ دیں، سلک بہ جاں ہے اسی دَر سے
یہ گلشنِ زہرا ہے ، امامت کا وطن ہے

پانی سے جو مچھلی کا ہے، آدم سے ہوا کا
وہ ربط مودّت ہے، موڈت کا چلن ہے

ہنس دیجیے کُھل کر بھی تو آنسو نکل آئیں
کیا کہیے کچھ ایسی روشِ چرخِ کہن ہے

آنسو ابھی سر پھوڑ رہے ہیں رگ و پے میں
اک حشر سا برپا پسِ دیوارِ بدن ہے

اک موج اُچھل کر سرِ داماں نہیں پہنچی
چلّو سی لحد میں فقط اک بوند بدن ہے

اک نور کا پیکر ابھی گزرا تھا اِدھر سے
اس گھور اندھیرے میں تو آہٹ بھی کرن ہے

ہم ہالۂ و ہم نالۂ شبیرؑ ہے اب تک
چپکا ہوا تن سے ابھی پیراہنِ تن ہے

اُترا نہیں دُلدُل سے مہِ شامِ غریباں
وہ رَو میں ابھی تک سرِ رہ وارِ سخن ہے

اک تیر ہے پیوستِ گلو آج بھی خالد!
اک درد ہے سینے میں کہ اعصاب شکن ہے

خالد احمد

سلام

ہر دل میں جاگزیں ہے محبت حسینؑ کی
جاری ہے آنکھ سے بھی عقیدت حسینؑ کی

زہراؑ سے اور علیؑ سے ہے نسبت حسینؑ کی
کیسے بھلا بیان ہو عظمت حسینؑ کی

فرمان ہے نبی کا ، ضمانت حسینؑ کی
ثابت ہے ، مستند ہے امامت حسینؑ کی

دامانِ دیں کو خونِ امامت سے بھر دیا
بے مثل ہے یہ طرزِ سخاوت حسینؑ کی

''اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد''
شاہد ہے اس یقیں پہ شہادت حسینؑ کی

روزِ ازل سے روزِ ابد تک لکھی گئی
ذلت یزید کے لیے ، عزت حسینؑ کی

جھکتا نہیں ہے سامنے باطل کے حق کبھی
پیغام دے رہی ہے شہادت حسینؑ کی

خالدہ انور

سلام

جو خیمہ زن ہوا صحرا میں کارواں کو سلام
کمالِ صبر و رضا کے اس آسماں کو سلام

لہو میں دھل کے ہوئی ہے امیں اجالوں کی
اے ریگِ کرب و بلا تیری کہکشاں کو سلام

حسینؑ رفعتوں کا تیری کیا کروں مذکور
فلک بھی کرتا ہے کربل کے آسماں کو سلام

لہو سے لکھی جو کرب و بلا میں تو نے حسینؑ
غریب و سادہ و رنگین داستاں کو سلام

جلیل کیسے نہ بھیجوں سلام میں ان پر
زمانے کرتے ہیں جب ان کے آستاں کو سلام

احمد جلیل

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

توصیف کرے اصغرؑ و اکبرؑ کی وہ وہ کیسے؟
زینب کے لیے ایک حسینؑ ، ایک حسنؑ ہے

سلام

شُعلہ اُٹھتا ہے اِدھر اور اُدھر بیٹھتا ہے
آپ کے در سے جو اُٹھتا ہے کِدھر بیٹھتا ہے

تھک چکے عابدِ بیمار جہاں بیٹھتے ہیں
طوق میں جکڑا ہوا شام نگر بیٹھتا ہے

تازیانوں سے بدن پر کوئی لکھتا ہے سَفر
تھک کے شبّیر کا جب لختِ جگر بیٹھتا ہے

میں وہ سائل ہوں جو خیرات کا طالب ہی نہیں
ورنہ رستے میں کوئی بارِ دگر بیٹھتا ہے

کاش پلکوں سے میں چوموں درِ اقدس اُن کا
جن کے پیروں میں شہادت کا ہنر بیٹھتا ہے

صفِ دشمن کی سراسیمگی بتلائے گی
ایسے شبیر کی تلوار کا ڈر بیٹھتا ہے

جہاں مل جائے جگہ مجلسِ شبیر میں بیٹھ
سب پہ یکساں ہے نظر کوئی جدھر بیٹھتا ہے

کوئی ہمشیر سے وہ آخری منظر پوچھے
کس طرح گھوڑے پہ حیدر کا پسر بیٹھتا ہے

شہہ کے خیمے کی طنابوں کو پکڑ کر دانش
رات بھر دشت میں اک سوختہ سر بیٹھتا ہے

دانش عزیز

سلام

تو محبت کا پیامی ہے حسینؑ ابن علیؑ
تیری جرأت کو سلامی ہے حسینؑ ابن علیؑ

عظمت آثار ترا نقش قدم ہے مولا
خواجگی تیری غلامی ہے حسینؑ ابن علیؑ

حشر تک سارے یزیدوں کے لئے مرگ اثر
آپ کا اسم گرامی ہے حسینؑ ابن علیؑ

وقت نے جیسے ترے ہاتھ پہ بیعت کی ہے
ہر زمانہ ترا حامی ہے حسینؑ ابن علیؑ

شائبہ کوئی نہیں اس میں ذرا بھی شر کا
خیر ہی خیر تمامی ہے حسینؑ ابن علیؑ

بدگمانی ہے ترے بارے ذرا سی جس کو
اس کے ہونے میں ہی خامی ہے حسینؑ ابن علیؑ

جس میں کچھ نور ہدایت کی رمق ہے موجود
تو ہر اس دل کا مقامی ہے حسینؑ ابن علیؑ

دنیا داروں کی خوشامد نہیں ہوتی مجھ سے
جب کہ سرور میرا حامی ہے حسینؑ ابن علیؑ

سرور حسین نقشبندی

سلام

کیا جلوہ کربلا میں دکھایا حسینؓ نے
سجدے میں جا کے سر کو کٹایا حسینؓ نے

ایسا لگا کہ دیکھ کے حوریں بھی رو پڑیں
قاسمؓ کی لاش کو جو اُٹھایا حسینؓ نے

خوش بخت تھا کہ آپ کے قدموں پہ آ گرا
سویا نصیب حُر کا جگایا حسینؓ نے

کیوں آپ کو نہ اپنے نواسےؐ پہ ناز ہو
ہر قول مصطفیٰؐ کا نبھایا حسینؓ نے

نیزے پہ سر تھا اور زباں پر تھیں آیتیں
قرآن اِس طرح بھی سنایا حسینؓ نے

فیضانؔ وہ تو ساقیٔ کوثر کے لعل تھے
کیسے کہوں کہ آب نہ پایا حسینؓ نے

نانا کے پاک نام پہ ہر چیز وار دی
کچھ بھی نہ اپنے پاس بچایا حسینؓ نے

صدمے سے قدسیوں کی بھی چیخیں نکل گئیں
اصغرؓ کو جب گلے سے لگایا حسینؓ نے

راہِ خدا میں جان کی بازی لگا گئے
پیشِ یزید، سر نہ جھکایا حسینؓ نے

اکبرؓ کی خشک آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے
صُغراؓ کا جب پیام سنایا حسینؓ نے

فیض رسول فیضان

سلام

صبر کی ہیں تصویر حسینؓ
سچ کی ہیں تفسیر حسینؓ

حق و باطل کے مابین
کھینچی ایک لکیر حسینؓ

نانا دیں کے ہیں سردار
نانا کی جاگیر حسینؓ

خون سے اپنے کربل میں
لکھی کیا تحریر حسینؓ!

حر جیسوں کی اک پل میں
بدل گئی تقدیر حسینؓ

تپتے صحرا میں پیاسے
کوثر تھی جاگیر، حسینؓ

جرأت و عظمت کا مینار
تیری وہ ہمشیر، حسینؓ!

ظلمت کے اس دور میں بھی
اک سچی تنویر، حسینؓ

صدیوں سے لاریب شفیق
ہم تیرے دلگیر، حسینؓ!

محمد شفیق انصاری

سلام

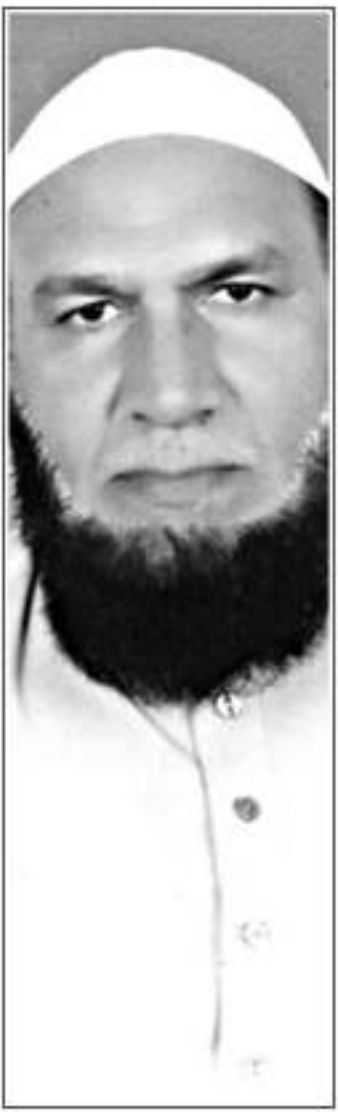

میدانِ کربلا میں جو پیاسا حسین ہے
دشمن کئی ہزار ہیں تنہا حسین ہے

دو پھول خوش اصول ہیں باغِ رسولؐ کے
اک خوش ادا حسن ہے تو دوجا حسین ہے

اے خاکِ کربلا ترے ذروں کو چوم لوں
تجھ پہ وطن سے دوری میں، تڑپا حسین ہے

میرا ہے یہ عقیدہ، کہوں گا میں برملا
سارے عدو ہی جھوٹے ہیں سچا حسین ہے

خلدِ بریں میں شان ہے کیا شان آپ کی
سب جنتی براتی ہیں دولھا حسین ہے

چشمِ فلک تو دیکھ، ہے زندہ حسینیت
باطل کے ساتھ ہر جگہ الجھا حسین ہے

مولا علیؑ حبیبِ محبانِ مصطفیٰؐ
مولا علی کی آنکھ کا تارا حسین ہے

دیکھا رضا یہ جرأت و غیرت کے باب میں
دینِ نبی تو سارے کا سارا حسین ہے

رضا اللہ حیدر

سلام

بھنور بھنور کے خزینے میں روشنی اتری
حسین آئے سفینے میں روشنی اتری

چراغ جونہی بجھا کربلا کے خیمے کا
وفا پرستوں کے سینے میں روشنی اتری

صدا بلند ہوئی جس گھڑی وہ ھل من کی
پھر اس کے بعد مدینے میں روشنی اتری

لڑی وہ جنگ کہ نو لاکھ ہو گئے تھے فنا
بہتروں کے پسینے میں روشنی اتری

حسین ہاتھ پہ اصغر کو جب اٹھا لائے
فلک سے نور کے زینے میں روشنی اتری

سمجھ میں آئے تھے یعقوت کے معانی مجھے
رضا جو دل کے نگینے میں روشنی اتری

ساجد رضا خان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مدّاحِ شبیرؑ میں آغازِ سخن ہے
اجماعِ شرف آج سرِ برجِ دَہن ہے

سلام

غمِ شبیر ہر غم سے سوا ہے
یہ غم دراصل ہر غم کی دوا ہے

لکھوں کیسے مصائب کربلا کے
نہیں یہ کربلا ، کرب و بلا ہے

وہ سجدہ لاکھ سجدوں سے ہے بڑھ کر
جو تلواروں کے سائے میں کیا ہے

یزیدیت سراسر کفر و باطل
حسینیت تو بس صبر و رضا ہے

انوکھا ہے یہ اندازِ حضوری
کہ سر کٹ کر بھی سجدے میں پڑا ہے

وہ جنت میں جوانوں کے ہیں سلطاں
میرے آقا محمد نے کہا ہے

جو ہو محبوب ، محبوبِ خدا کو
وہ ہی اشفاق محبوبِ خدا ہے

محمد اشفاق بیگ

سلام

کوفہ ترے بازار میں سرکار کا بیٹا
دیکھا نہیں ایسا کسی سردار کا بیٹا

اے حُرؑ، تری قسمت پہ سدا ناز رہے گا
خوش تجھ سے ہوا احمدِ مُختار کا بیٹا

اسلام بچانے کے لیے آل کو لے کر
کربل میں ہے پہنچا مرے سالار کا بیٹا

عاشور کے دن دشت میں تنہا ہی لڑا تھا
اس شیر خدا ، حیدر کرار کا بیٹا

ہے کتنا حسیں ، کتنا جری ، کتنا بہادر
معصوم سا اصغر مرے غمخوار کا بیٹا

مخلوق تو کیا ارض و سماوات بھی تڑپے
زنجیروں میں دیکھا شہِ اَبرار کا بیٹا

گریہ ہی تو طلحہ میرا سرمایۂ کل ہے
میں ان کا غلام اور عزادار کا بیٹا

طلحہ غفور

سلام

اے حسین ابن علیؑ! تیری امانت کو سلام
ضیغمِ کرب و بلا! تیری شجاعت کو سلام

کیا خبر تھی دُرِ سکینہ کے اُتارے جائیں گے
دخترِ والا صفت کے عزم و ہمت کو سلام

بیبیوں کی عزت و حرمت تمھارے دم سے تھی
بے ردا جو ہو گئیں، ان کی طہارت کو سلام

موت اصغر کی جو لکھی وقت کی تاریخ نے
اے محمد کے نواسے! اس عبادت کو سلام

مر کے روشن کر دیا نانا کی امت کا چراغ
ظلمتوں میں جگمگاتی اس روایت کو سلام

یاد ہیں تیری وفائیں، جب تلک زندہ ہیں ہم
حضرتِ عباس تیری ہر عنایت کو سلام

آرزو ہے، جاں کنی کے وقت ہو وردِ زباں
مصطفےٰ کے لاڈلے کی استقامت کو سلام

خالق آرزو

رباعیات

گلشن کے نگہدار بنے خار کہ گُل
دشمن کے لیے وار بنے خار کہ گُل
جب کلیوں کی عزت کی طرف ہاتھ اُٹھے
بتایئے دیوار بنے خار کہ گُل

.....

ذرے دُور گوہر کی طرف دیکھتے ہیں
قطرے مہ و اختر کی طرف دیکھتے ہیں
رہتے ہیں پریشان کہ طالب اکثر
نیچے نہیں اوپر کی طرف دیکھتے ہیں

.....

خطرے کا نشاں صورتِ حالات میں ہے
تو محو مگر اپنی حسیں ذات میں ہے
اے آہو ءِ معصوم خدا خیر کرے
ہر گرگِ جہاندیدہ تری گھات میں ہے

.....

مانا ابھی ترغیب ہوس ہے تجھ میں
لیکن پرکشش چند نفس ہے تجھ میں
اے گل اِسے بے لوث رفاقت نہ سمجھ
بھنورے ہیں ترے گرد کہ رس ہے تجھ میں

میں روزِ ازل سے ہوں الستی یا رب
منکر نہیں ہرگز میری ہستی یا رب
مٹی میں ملائے مرے اسبابِ حیات
خاکم بدہن کیا نہیں مستی یا رب

.....

حد چاہے خطا میں نہیں چھوڑی باز آ
عصیاں کی طرف زندگی موڑی باز آ
رحمان کا در ، در نہیں مایوسی کا
سو بار بھی توبہ ہو جو توڑی باز آ

گلزار بخاری

رباعیات

تخلیق کے لمحات میں آفاق آثار
میری تمثال ، میرے تمثال نگار
یا غرفۂ شب میں اک مہکتا ہوا چاند
یا پردۂ شام پر دہکتے انگار

اب دُور نہیں کشتیِ جاں کی منزل
مل جائے گا بحرِ آرزو کا ساحل
دشتِ سفرِ فراق تو کچھ بھی نہیں
دو چار گھڑی کہیں بہل جا اے دل!

منزل تک مختصر سفر باقی ہے
اے میری ہم سفر! سفر باقی ہے
اے عمرِ رواں! کہیں ذرا سستا لے
کچھ کم ہی سہی مگر سفر باقی ہے

ہر عہد کے دامن میں نہیں فصلِ گلاب
ہوں جس سے مسرتوں کے غنچے شاداب
فطرت کا اصول ہے، نہیں ہو سکتا
ہر رات کی کوکھ سے طلوعِ مہتاب

ہر روز نیا بابِ سفر کھلتا ہے
ہر منظرِ نو نگاہ پر کھلتا ہے
کھلتا ہے دروازۂ مشرق خالد
یا تازہ مصیبتوں کا در کھلتا ہے

گردابِ حوادث میں کہاں تک رہتے
کب تک طوفان کے تھپیڑے سہتے
شل ہو گئے دست و پا تو دم ٹوٹ گیا
بحرِ آشوبِ جاں میں بہتے بہتے

بحرِ ستم و جور میں بہنے کے لیے
ظلمت کدۂ جہاں میں رہنے کے لیے
زندہ ہے آدمی مسلسل خالد
حالات کا سرد و گرم سہنے کے لیے

آنے کو ہے ایک پل نہ ٹلنے والا
اندازِ حیات ہے بدلنے والا
گم کردۂ راہِ راست کچھ ہوش میں آ
ہے عمر کا آفتاب ڈھلنے والا

خالد علیم

قطعات

تکبر

کام آتے نہیں ، بڑے دعوے
بڑ، جوماریں وہ منہ کی کھاتے ہیں
شاملِ حال ہو ، تکبر تو
''ٹائی ٹینک'' بھی ڈوب جاتے ہیں

.....

فادر ڈے

ویسے حیرت تو اس پہ بنتی ہے
آپ ناراض ہو ، نہ جائیں تو
اہلِ مغرب کے ہی، بتانے پر
'' باپ کا یوم''، ہم منائیں تو

.....

رخ

تتلیاں پھول کب سدا بھنورے
جلوے رہتے نہیں ، اداؤں کے
بات یہ ذہن میں ، مری رکھنا
رخ بدلتے بھی ہیں ہواؤں کے

.....

لبادے

روپ سارے یہ دنیا ، داری کے
دلِ نادان کو ، بتایا کر
یہ لبادے ہیں دانت ، ہاتھی کے
ان لبادوں پہ تو ، نہ جایا کر

نیلم آنکھیں

بد نظر سے بچاؤ ، کی خاطر
اس کے رخسار ''تِل''، کا پہرہ تھا
پاؤں تھے مور ، جیسے اس کے اور
نیلم آنکھیں تھیں چاند، چہرہ تھا

عاصم بخاری

Masaoka Shiki ہائیکو تراجم

خاور اعجاز

In our parting,
between boat and shore
Comes the willow-tree

ہم بچھڑے تھے یوں
کشتی اور ساحل کے بیچ
تھا بید مجنوں

....

The leaves of the willow fall,
Scraps of vegetables
Floating donw the brook

گرتے ہیں پتے
یا ندی کی آنکھوں میں
خوابوں کے ٹکڑے

....

The morning-glory
Trails over the ground
Of the empty house

صبحِ طرح دار
خالی گھر کے آنگن میں
پھرتی ہے بے کار

محمد اظہار الحق اسلامی تہذیب کا ستارہ

ادرا کی تنقید کا بڑا سیدھا اور شفاف اصول ہے کہ کسی تخلیق پارے کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے تخلیق کے باطن اور تخلیق کار کی ذات کے مطالعے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خارجی سطح کی شاعری موجود ہے جیسے کسی شخصیت یا پہلے سے طے کیے گئے فرمائشی موضوع پر شعر کہنا اور آخر میں کوئی سبق آموز بات کر دینا لیکن میرے نزدیک اسے کمرشل شاعری تو کہا جاسکتا ہے خالص شاعری قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اب دوسری طرف بھی زیادہ تر معروضی عوامل ہی موضوعی تخلیقی انگیخت کا باعث ہوتے ہیں لیکن جب تک یہ عوامل احساسات، جذبے اور تفکر کی بھٹی سے ہو کر نہ نکلیں تخلیقی کہلانے کے کم ہی حق دار ٹھہرتے ہیں۔ شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ فرق ہمیں شعریت کی کمی، بیشی یا نہ ہونے سے محسوس بھی ہو جاتا ہے۔ شاعری ایسا سفاک آئینہ ہے جو شاعر کا خارج باطن سب عیاں کر دیتا ہے۔ اگر یہ عریانی تخلیقی سچائی سے پھوٹے تو اس جیسا شفاف لباس ڈھونڈنے سے نہ ملے اور اگر جھوٹ سے برآمد ہو تو لاکھ پردوں میں بھی چھپائے نہ چھپے۔

میں تو اس بات کا بھی قائل ہوں کہ سماجی و اخلاقی حوالے سے تخلیق کار کا نیک و بد ہونا جس بھی زمرے میں آئے لیکن وہ شعر میں اسے چھپانے کی کوشش نہ کرے تو یہ تخلیقی سچائی ہوگی لیکن اس کے لیے انسان کا اندر سے بڑا انسان ہونا شرط ہے۔ کمزور آدمی کے لیے یہ ناممکن ہے کہ اتنی بڑی اخلاقی جرأت کر سکے۔ یعنی اگر شاعر دنیا کی نظر میں جو بھی ٹھہرے شاعری میں جھوٹ نہیں بول رہا تو وہ تخلیقی طور پر ایک باکردار شخص ہے۔ بنیادی بات یہ کہ دنیا سے آپ لاکھ چھپتے پھریں کم از کم شاعری سے تو فریب نہ کریں اور میرا تو یہ بھی ماننا ہے کہ شاعری یہ بھی ظاہر کر دیتی ہے کہ آپ جھوٹ بول رہے ہیں اور کتنا جھوٹ بول رہے ہیں۔

شاعر کو بیچ چوراہے ننگا کر دینا شاعری کو اچھی طرح سے آتا ہے۔

محمد اظہار الحق کا تازہ مجموعہ کلام میرے زیر مطالعہ ہے۔ میں انہیں ذاتی طور پر بھی جانتا ہوں اس لیے درج بالا تمہید باندھنا پڑی کہ مجھے وہ اپنے پچھلے شعری مجموعوں کی طرح، اے آسماں نیچے اتر'' میں

فرحت عباس شاہ

بھی ہو بہو محمد اظہار الحق نظر آئے ہیں۔
اپنے درج بالا قائم کیے ہونے استدلال کے ثبوت کے طور پر محمد اظہار الحق کا شعر پیش کر رہا ہوں۔۔

لباس تھا ہی نہیں میر جسے بدلتا
برہنگی ہو گئی پرانی بدل رہا ہوں

.....

جی چاہ رہا ہے ناقدین اور محققین کی ایک اور گتھی بھی سلجھا دوں۔ اکثر سننے اور پڑھنے میں آیا ہے کہ فلاں شاعر صاحب اسلوب شاعر ہے لیکن آج تک یہ نہیں پتہ چل سکا کہ کوئی شاعر صاحب اسلوب شاعر کیوں ہوتا ہے۔ بلکہ سچ پوچھیں تو اسلوب کی کوئی واضح اور نپی تلی تعریف تک موجود نہیں۔
حالانکہ یہ سیدھی سیدھی بات ہے کہ جو تخلیق کار صاحب اسلوب شخصیت ہوگا وہ صاحب اسلوب شاعر یا تخلیق کار بھی ہوگا۔ دراصل انسان کی ذات کا اسلوب ہی اس کی تخلیق سے منعکس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شکیب جلالی کی شاعری میں معصومیت اور جدت یا جدت اور کرب کے ناک نقشے سے ابھرتا اسلوب نظر آتا ہے جبکہ ظفر اقبال کی شاعری (جسے میں شاعری نہیں سمجھتا) میں چالاکی، فنکاری، اور ہیرا پھیری سے مزین اسلوب یعنی لسانی تشکیلات اور اگاڑ پچھاڑ کی شعوری کوشش۔ میں یہاں اس مضمون میں شاید اسلوب پر عمومی بات اتنی تفصیل سے نہ کرتا اگر مجھے محمد اظہار الحق پر اکیڈمی آف لیٹرز کے سلسلے ''معمار ادب'' کے تحت ''محمد اظہار الحق: شخصیت اور فن'' کے صفحہ نمبر 61 پر محمد اظہار الحق کا اسلوب کے عنوان سے جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے اختلاف مقصود نہ ہوتا۔ کتاب کے مصنف نے اسلوب کے نام پر شاعر کی شاعری میں جتنے شہروں کے نام آئے ہیں سب کے سب لکھ کر پھر ان شہروں کے بارے معلومات بھی فراہم کی ہیں۔ اور تو اور ساتھ ساتھ کلاسیکی شاعروں کے ہاں شہروں کے نام والے اشعار کوٹ کر کے اپنے تئیں اسلوب کو حوالہ جات سے ثابت بھی کرنے کی کوشش کی ہے ۔ میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس موضوع پر اپنی طالب علمانہ رائے کو کھل کر بیان کروں۔
اسلوب کیا ہے۔ یہ سوال عموماً ہر نئے شاعر کے ذہن میں سر اٹھاتا ہے لیکن اس کا جواب کم کم ہی ملتا ہے۔
ہم اگر آسان لفظوں میں سمجھنے کی کوشش کریں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ وہ خاص ''وضع قطع'' ہے جس سے ہم کسی ایک کو دوسرے سے مختلف دیکھتے ہیں۔ اسلوب کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ پہلے سے موجود کسی بھی مروجہ طور یا فیشن سے ہٹ کے ہوتا ہے اور کئی دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ آنے والے عہد میں فیشن بن جائے اور بعد میں آنے والے اسے اختیار کریں۔ جیسے میر کے اسلوب کو اختیار کرنے والوں میں سب سے نمایاں نام ناصر کاظمی کا ہے۔
اردو شاعری میں صاحب اسلوب شعرا میں ممتاز ترین نام میر، غالب، اقبال، شکیب جلالی، منیر نیازی، اختر حسین جعفری، ن۔ م راشد اور

شیر افضل جعفری کے ہیں۔ ان شعرا میں سے میر اور تلمیح جلالی ایسے ہیں جن کے اسلوب فیشن بن جانے کے مرتبے پر فائز ہوئے اور لاتعداد شعرا نے ان کو اپنایا۔

اسلوب کا ہونا شاید کار زار شعر میں نایاب اور مشکل ترین مظہر ہے جسے کوشش سے حاصل کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق براہ راست اس مابعد الطبعیاتی سٹرکچر سے ہے جس پر شعر کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔

اسی لیے یہ ارادی کے بجائے غیر ارادی اور شعوری کے بجائے لاشعوری عمل کے طور پر وقوع پزیر ہوتا ہے۔

شعری یا نثری یا دیگر فنون میں نظر آنے والا اسلوب دراصل تخلیق کار کی ذات اور شخصیت کا ہی اسلوب ہوتا ہے ۔ جب تک تخلیق کار کے محسوس کرنے، سوچنے اور اظہار کرنے کا ایک خاص اور منفرد انداز نہیں ہوگا اسکے اظہار کرنے کا انداز بھی مختلف نہیں ہوگا۔

اگرچہ شعری اسلوب کو ہم کسی شاعر کی زبان، لفظیات، خیال کی روش، علامتوں، استعاروں، تشبیہوں کے ظہور اور شعری لہجے کی تخصیص سے پہچانتے ہیں لیکن یہ سب کچھ تبھی ممکن ہوتا ہے جب یہی خصائص اسی انفرادیت کے ساتھ شاعر کی ذات میں اور اس کی تخلیقی شخصیت کا حصہ ہوتے ہیں۔ میں اسی لیے کہتا ہوں کے اچھے شعرا ہمیشہ ٹرینڈز کو فالو کرنے کے بجائے اپنے اندر موجود نظام تخلیق اور واردات قلبی پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنا راستہ الگ بناتے ہیں۔ بلکہ بناتے بھی کیا ہیں خود بخود بنتا چلا جاتا ہے۔ اسی طرح بہت سارے شاعر کوشش کے باوجود صاحب اسلوب شاعر نہیں بن پاتے بلکہ اس کوشش میں کہیں کے بھی نہیں رہتے کیونکہ اختیاری اسلوب حقیقی نہ ہونے کی وجہ سے بار بار ان کے ہاتھ سے پھسل جاتا ہے۔

ایک اور اہم بات جو سامنے لانا ضروری سمجھتا ہوں کہ پہلے تو کسی کا صاحب اسلوب ہونا ہی بہت مشکل ہے لیکن اس سے بھی مشکل کام صاحب اسلوب ہو کر پھر اپنے ہی اسلوب سے نکل کر اپنے اندر نئے اسلوب کو دریافت کر کے سامنے لانا ہے۔

اس بات کا تجربہ مجھے اس وقت ہوا جب میں اپنی پہلی کتاب "شام کے بعد" سے چوتھی کتاب "صحرا خریدلائے ہیں" تک پہنچا اور چاروں کتابوں میں ایک ہی اسلوب کو محسوس کیا۔

تو یہ سوچ کر کہ کچھ نیا دریافت کیا جائے مشاہدۂ باطن کے دشوار گزار سفر پر روانہ ہوا۔ یہ جستجو مجھے میرے پانچویں شعری مجموعے "خیال سو رہے ہو تم" میں ایک نئے اسلوب تک لے آئے تو راز کھلا کہ انسان کے اپنے اندر بھی ایک سے زیادہ جہان آباد ہوتے ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف بھی ہو سکتے ہیں اور متضاد بھی۔ طویل نظم "سرابی" اور طویل نظم "روگ" کی تخلیق سے منکشف ہوا کہ بعض اوقات موضوع، فکر اور کیفیت کے تنوع کی ریاضت سے بھی انسان اپنے تخلیقی بطن سے نئے سے نیا اسلوب دریافت کر سکتا ہے۔ ذاتی تجربے کی مثال اس لیے دی ہے کہ خود پہ گزری ہوئی کا احوال انسان سنی سنائی کی نسبت زیادہ بہتر

طور پر بیان کر سکتا ہے۔

محمد اظہار الحق مزاجاً، نظریاتی طور پر اور عملاً سرتاپا اسلامی تہذیب میں گندھے ہوئے انسان ہیں۔ اگر ہم تھوڑا مزید تخصیص سے کام لیں تو یہ کہنے میں کوئی مبالغہ نہیں ہوگا کہ ان کی ذات اور تخلیقات میں ایسے تہذیبی عناصر غالب رویے کی حیثیت رکھتے ہیں جن کا تعلق بادشاہت سے نہیں بلکہ فقر سے ہے۔ لیکن یہ فقر تصوف سے زیادہ مائل بہ شریعت ہے۔ محمد اظہار الحق اپنی شخصیت اور فن دونوں میں ایک نیک انسان کا پیکر ہیں۔ وہ تو شکر ہے کہ شاعری نے انہیں بال بال بچا لیا کیونکہ حضرت شاعر نہ ہوتے تو پکے پکے مولوی تھے۔

محمد اظہار الحق کا شعری اسلوب شہروں کے ناموں اور قرآنی تلمیحات سے نہیں بلکہ اسلامی تہذیبی ایمان سے تشکیل پاتا ہے۔ میں یہاں اسلامی تہذیبی شعور یا ادراک وغیرہ بھی کہہ سکتا تھا لیکن پھر بات عمومی بھی ہو جاتی اور چھوٹی بھی۔ محمد اظہار الحق اسلامی شعار، تہذیب، فکر و فلسفہ اور نظریے پر ایسا ایمان رکھتے ہیں جو ان کی ذات و گفتار اور کردار کے ساتھ ساتھ ان کے کلام سے بھی چھلک چھلک پڑتا ہے۔ جس میں آئینے کی طرح صاف، شفاف اور دوٹوک ہونا ان کی نمایاں ترین صفات ہیں جو ان کے تخلیقی عمل کو سمجھنے کی کوشش کے دوران مجھے نظر آئیں۔

ادراکی تنقیدی تھیوری کے خدوخال مرتب کرنے کے دوران میں تلاش کرتا رہا کہ اگر کسی شاعر کے ہاں مجھے تخلیقی عمل کے تجربے سے گزرنے کا بیان مل جائے تو میرے لیے مستقبل کے ناقد اور ادب کے سنجیدہ طالب علم کو اپنا مطمع نظر سمجھانا زیادہ آسان ہو جائے گا۔ محمد اظہار الحق نے میری یہ الجھن بڑی سادگی سے دور کر دی ہے۔ تخلیقی عمل سے داخلیت کو منہا کر کے صرف خارجی سٹرکچر پر توجہ مرکوز رکھنے والے دراصل ایک طرف تو خود تخلیق کے الہامی جمال سے محروم رہتے ہیں اور دوسری طرف ادب کشی اور تخلیق دشمنی کے مجرم بھی ٹھہرتے ہیں۔ شعر کے تخلیقی عمل کے لیے یا عمل کے دوران میسنے میسرے ترتیب دینے کی حکمت عملی محمد اظہار الحق کی اس غزل میں دیکھیے ---

تلازمے شاعری کے سب رفتگاں سے لیں گے
سرشک بلبل سے، رنگ رخ زعفراں سے لیں گے

ملیں گے آسمگاں کو تبریز اور حلب میں
گئے ہوؤں کی نشانیاں اصفہاں سے لیں گے

الگ بنائیں گے ہم کہیں کائنات اپنی
زمیں سے منشق لیں گے، چاند آسماں سے لیں گے

بیاں کریں گے دراصل رخسار کی حکایت
مگر ذرا اک کنایہ آب رواں سے لیں گے

جو راستہ بھول ہی گئے دشت ہے کسی میں
مدد بھٹکتے ہوئے کسی کارواں سے لیں گے

ہمیں بنائیں گے مشت بھر خاک سے مکرر
یہ مشت بھر خاک، جسم کے خاکداں سے لیں گے

میں ان کے کشکول میں زمینیں تو ڈال دوں گا
مگر یہ دریوزہ گر مضامیں کہاں سے لیں گے

سگان دربار کون ہیں قدر کرنے والے
ہم اپنا اکرام اپنے خواندگاں سے لیں گے

مندرجہ بالا غزل حیران کُن حد تک تخلیقی عمل کی تمام حالتوں، عناصر اور ترکیبی عوامل کو بیان کرتی ہے۔ لیکن مجھے لگتا ہے محمد اظہار الحق نے اپنے اندر کے فطری شاعر کی نیچرل گروتھ نہیں ہونے دی اور اس کی اسلامی شعار کے مطابق روک ٹوک کی ہے اور نوک پلک سنواری ہے۔ یہ ایک مشکل ترین کام ہے کہ اپنے اندر کے منہ زور گھوڑے کو نظریے کی لگام ڈال کے رکھنا اور اس کے ہر ہر قدم پر درست سمت کے تعین کو مسلسل کھینچ کے رہنا۔

شجر بنایا عجیب اک شاعری سے میں
پھر اس کی شاخیں کہ جس پہ لال دگھر لگے ہیں

محمد اظہار الحق کی زندگی گزارنے کے طور طریقوں اور تخلیقی عمر بسر کرنے کے قرینوں کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ ان کے اردگرد سگ ہائے دربار شاہاں اور راتب پہ لپکتے ظرف و ضمیر سے تہی نام نہاد شعرا کا اتنا ہجوم تھا کہ انہیں شعوری سطح پہ اپنی ذات کے اندر ایک الگ تھلگ شہر بسانا پڑا۔ ایک ایسا شہر جس میں حرص و ہوس نہیں تھی، قناعت تھی، جس میں جبر نہیں تھا رحم تھا، جس میں فریب کاری نہیں تھی وفا تھی اور جس میں منافقت نہیں تھی ہمدردی اور شفقت تھی۔ یہی وہ بنیادی فیصلہ تھا جس کے بعد محمد اظہار الحق ایک بالکل مختلف شعری خطے اور تخلیقی منہاج کے طور پر سامنے آئے۔ وہ نوکریوں کے لیے تلوے چاٹتے ماحول کو ٹھوکر کی نوک پر رکھ کے اور نوکریوں کے بل بوتے پہ مشاعرے چاٹتے کچھر پر چار حرف بھیج کر زمانے میں رہتے ہوئے زمانے سے مختلف ہونے کی مثال بن گئے۔ یہی ہے محمد اظہار الحق کا اسلوب جو ان کی ذات سے لیکر شاعری تک پوری ادبی کائنات میں مختلف اور منفرد نظر آتا ہے۔ انہوں نے بادشاہوں پر مسکینوں سے رشتہ جوڑنے کو ترجیح دی، خاک نشینی کی فضیلت کے منکشف ہونے کا رتبہ حاصل کیا اور تخت نشینوں کو ہمیشہ ٹھوکر پر رکھا:

جو فائدہ ہے نقصان سے دے
مجھے پانی ریگستان سے دے

دے لفظ کوئی تاثیر بھرا
اک ٹکڑا دسترخوان سے دے

گٹھری سر پر امیدوں کی
چھٹکارا اس سامان سے دے

اک مٹھی گیہوں کافی ہے
لیکن اپنے کھلیان سے دے

آیا ہے فرشتہ جاں لینے
مجھے عزت اس مہمان سے دے

محمد اظہار الحق نے خود کو ن۔ م راشد کی طرح تہذیبی تذبذب تلے کچلے جانے کے بجائے شعر کو دنیا کی سب سے بڑی سچائی پر ایقان سے مرصع کیا۔ اقبال کی طرح ملت کو جگانے کی

نصیحت کر کے برصغیر کے ٹکڑے کرنے کے برطانوی ایجنڈے پر عمل کرنے کے بجائے اپنے اسلاف کی مثالیں بتا کر راستہ سجھایا۔

ایسے میں محمد اظہار الحق نے نفس کشی کی تپسیا اور ریاضت سے گزرتے ہوئے اپنی معصوم خواہشوں، بھولی بھالی آرزوؤں، بے چین خیالوں اور حتیٰ کہ سہمی ہوئی اداسیوں کی بھی قربانی دی۔ نہ کبھی کھل کے روئے نہ کبھی دل کھول کے ہنس سکے۔ لیکن اس کے بدلے جو ملا وہ بہت قیمتی اور انمول ہے۔ محمد اظہار الحق کو کائنات کی بے ثباتی اور حقیقت کی حقیقت صرف سمجھ ہی نہیں آئی بلکہ ان پر منکشف بھی ہوئی ہے، نظر آئی ہے۔ اور یہ کوئی کم عطا نہیں ہے۔ اس لیے کہ محمد اظہار الحق کی پوری شاعری جس اعتماد اور یقین سے بھری ہوئی ہے یہ عین الیقین سے بھی اگلی منزل ہے۔

یہی یقین اسے جانے کیا کچھ بدل ڈالنے کی طاقت عطا کیے ہوئی ہے۔ مجھے محمد اظہار الحق کی ایک اور خصوصیت کی نشاندہی کرنے دیجیے جو اسے پوری شعری تاریخ میں الگ مرتبے پر فائز کرتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کی پوری شاعری میں عمل اور کردار خیال اور تصور پر غالب مظہر کے طور پہ سامنے آتا ہے۔ درج ذیل اشعار دیکھیے---

لغت وہی ہے فقط معانی بدل رہا ہوں کہ تمھارے دریاؤں کا میں پانی بدل رہا ہوں

سنو علاقے ہیں اور بھی یاورفتگاں کے سنو میں انداز نوحہ خوانی بدل رہا ہوں

وہی ہیں عیار اور زنبیل بھی وہی ہے مگر میں بغداد سے کہانی بدل رہا ہوں

وہ آئے گا تو ستارہ اپنی جگہ نہ ہو گا اسے بتائی تھی جو نشانی بدل رہا ہوں

لباس تھا ہی نہیں میسر جسے بدلتا! برہنگی ہو گئی پرانی بدل رہا ہوں

جواں تو بیٹے ہوئے ہیں، رکھے خدا سلامت مجھے لگا جیسے میں جوانی بدل رہا ہوں

پرند میرے وزیر، جگنو سفیر ہوں گے میں اپنا انداز حکمرانی بدل رہا ہوں

میں خاک کے فرش پر ہوں، دست دعا اٹھائے وہ فیصلے جو ہیں آسمانی، بدل رہا ہوں

محمد اظہار الحق کی شاعری کو اگر کردار و عمل کی شاعری قرار دیا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ ایسے شاعروں کے لیے روٹین کے ناقدین اور عامیانہ تنقیدی انداز نہ صرف نقصان دہ ہے بلکہ غور کیا جائے تو باقاعدہ مسخرانہ سرگرمی لگتی ہے جس پر دل تو ہنسنے کو کرتا ہے لیکن اردو کے جعلی قدآور شخصیات کا بونا پن دیکھ کے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ میں چاہتا تو مجموعہ کلام ''اے آسماں نیچے اتر'' کے سوڈو فلیپ نگاروں کی طرح تلازمہ کاری، علامتیں، صنائع بدائع، تلمیحات، شعری فضا اور ڈکشن وغیرہ جیسی پرانی گھسی پٹی باتوں کے ساتھ کچھ ریشمی اور لچھے دار گفتگو فرما کر شہیدوں میں شامل ہو سکتا تھا لیکن میرے لیے یہ اتنا ہی مشکل ہے جتنا محمد اظہار الحق کے لیے ان بہروپیوں سے جان چھڑوانا۔

☆☆☆☆☆

پروفیسر کلیم احسان بٹ کی ''غالب سرائی''

مرزا اسداللہ غالب نے تو ایک بار زمانے کی ناقدری کے زیرِ اثر یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ''غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں''، مگر وقت نے ثابت کر دیا کہ غالب کے بغیر کوئی کام نہیں چلتا۔ تازہ ترین مثال پروفیسر کلیم احسان بٹ کی تحقیقی کتاب ''غالب سرائی'' ہے جو غالب کے بارے میں تقریباً چھیاسی اہلِ قلم کے منظوم خراجِ عقیدت پر مشتمل ہے اور جو حال ہی میں ایک اور پرستارِ غالب اور معروف ناشر شاعر علی شاعر کے ادارے رنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی سے عمدہ کاغذ اور گیٹ اپ کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ چونکہ راقم السطور بھی ان دنوں مرزا غالب کی غزلیہ زمینوں میں شعرائے کرام کی کہی گئی نعتوں پر مشتمل ایک کتاب مرتب کر رہا ہے اس لیے اس کے لیے اس کتاب کی اہمیت کئی حوالوں سے دوچند ہو گئی ہے۔

پروفیسر کلیم احسان بٹ کا شمار ان معدودے چند اہلِ فکر و دانش میں ہوتا ہے جو کسی صلے اور ستائش کی تمنا سے دور رہ کر اپنے آپ میں اور تخلیق و تحقیق کی دنیا میں مگن رہتے ہیں اور ہمہ وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتے ہیں۔ تاحال ان کے پانچ شعری مجموعے نقادانِ فن سے داد و تحسین وصول کر چکے ہیں، ان کی وجہ شہرت محض شاعری نہیں بلکہ ان کا تحقیقی و تنقیدی کام بھی بڑا منفرد انداز کا اور اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی کئی تنقیدی کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ فروغِ ادب کے حوالے سے بھی وہ ہمہ وقت سرگرم رہتے ہیں، جب راولپنڈی میں تھے تو گورنمنٹ ڈگری کالج میں آئے دن کوئی نہ کوئی محفل برپا رکھتے تھے، اب جلالپور جٹاں جیسے نسبتاً مضافاتی علاقے کے کالج میں بطور پرنسپل تعینات ہیں تو وہاں بھی کسی نہ کسی بہانے تقریبات کا سلسلہ چلاتے رہتے ہیں، حال ہی میں دو روزہ ادبی کانفرنس اور کتاب میلہ کا انعقاد اس کی روشن مثال ہیں۔ کتاب سے ان کا عشق کسی تعارف کا محتاج نہیں۔

''غالب سرائی'' کے پیش لفظ میں مرتب پروفیسر کلیم احسان بٹ نے انکشاف کیا ہے کہ غالب سے ان کی دلچسپی کا آغاز دورانِ تعلیم ہی میں ہو گیا تھا اور غالب کے متعلق لکھی گئی کتب، غالب کے کلام کی تشریحات، غالب کی زمین میں کہی گئی غزلیں، غالب کے انگریزی تراجم، غالب کی شان میں کہی گئی شاعری، غالب کے خطوط، کوئی پہلو ایسا نہ تھا جس نے انہیں متاثر نہ کیا ہو۔ انہوں نے کافی عرصہ اس پہلو پر بھی تحقیق کی کہ مزاح نگار نثر نگاروں پر غالب کے اثرات کیا ہیں، اسی تلاش اور تحقیق کے دوران ان کے پاس بہت سا مواد جمع

نسیم سحر

ہوتا گیا۔ اب ''غالب سرائی'' اسی مواد کے کچھ حصے کی تالیف و ترتیب کے نتیجے میں وجود میں آئی ہے۔

غالب پر شعرائے کرام کے شعری اظہار کا سلسلہ غالب کی زندگی ہی میں شروع ہو گیا تھا اور ان کی مقبولیت و شہرت کا یہ عالم تھا کہ ان کی وفات پر بھی شعرا کی ایک بڑی تعداد نے تاریخِ وفات کہی، غالب کی زمینوں میں غزلیں کہنے، غالب پر نظمیں کہنے اور غالب کی زمینوں پر مزاح نگار شعرا کے مزاحیہ کلام کا سلسلہ تب سے جاری ہے اور حقیقت یہ ہے کہ تقریباً ہر چھوٹے بڑے شاعر نے کسی نہ کسی طرح غالب کو موضوع بنایا ہے۔ اس لحاظ سے پروفیسر کلیم احسان بٹ کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں کہ ''حقیقت یہ ہے کہ غالب وہ خوش قسمت شاعر ہے جس نے نہ صرف حیاتِ جاوداں پائی بلکہ اس کے اپنے زمانے نے بھی اسے نظر انداز نہیں کیا۔۔ ان کے مخالفین کی طرح ان کے چاہنے والوں کا حلقہ بھی کم نہیں تھا ۔۔۔ چنانچہ ۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء کو وفات کے سو سال بعد بھی غالب مقبولیت کے اس عروج پر تھا کہ پاکستان اور ہندوستان میں بیک وقت جشنِ غالب منایا گیا۔''

یہاں راقم السطور یہ اضافہ کرتا چلے کہ اسی سلسلے میں جب بہت پہلے غالب صدی منائی گئی تو ہندوستان کے ایک معروف شاعر مظہر بھوپالی نے کہا تھا ''وہ صدی تمہاری تھی، یہ صدی ہماری ہے'' لیکن وقت نے ثابت کیا کہ یہ صدی بھی غالب کی ہے، اور شاید آئندہ آنے والی صدیوں میں بھی سب سے بڑا شعری حوالہ غالب ہی ہو۔

پروفیسر کلیم احسان بٹ کی اس کتاب میں شامل شعرا کی شاعری کئی عشروں پر پھیلی ہوئی ہے اور غالب سرائی کا یہ سلسلہ اب بھی جاری و ساری ہے۔ کوئی شک نہیں کہ غالب کی وفات کے ڈیڑھ سو سال بعد بھی غالب کے نام پر دنیا بھر میں کئی ادارے اور انجمنیں قائم ہیں۔ سینکڑوں غالب شناس غالب پر لکھ کر شہرت و نام کما چکے ہیں اور کمال یہ ہے کہ ''غالبیات'' کے عنوان سے باقاعدہ ایک مضمون کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہو چکا ہے۔

اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مکانی و زمانی طور پر کسی جگہ اور عہد میں قید نہیں بلکہ اس میں وہ تمام شعرا شامل ہیں جو ہر اس جگہ مقیم ہیں جہاں اردو بولی جاتی ہے۔

اسی طرح پروفیسر کلیم احسان بٹ جیسے عمدہ غزل گو شاعر نے یہ تنقیدی و تحقیقی چلک بھی دکھائی ہے کہ غالب سرائی میں انہوں نے محض غزل گو شعرا کا کلام شامل کرنے کے بجائے تمام اصنافِ شعر پر مبنی کلام پیش کیا ہے جن میں قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، قطعہ، رباعی، مخمس، مسدس، ترکیب بند، سانیٹ، آزاد نظم، نثری نظم سمیت تمام متنوع شکلیں موجود ہیں، ان تمام منظومات کی شمولیت کسی زمانی ترتیب یا عمروں کے لحاظ سے کرنے کے بجائے الفبائی رکھی گئی ہے جس سے کسی کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔

کتاب میں شامل تخلیقات کی تعداد ۸۶ ہے جنہیں پھولوں کے ایک خوشبودار اور رنگ دار گلدستے سے تشبیہ دی جا سکتی ہے، اس کے دیباچہ نگاروں میں ڈاکٹر فہمیدہ تبسم، اکرم کنجاہی اور سید روح الامین جیسے معروف نام شامل ہیں جبکہ ناشر اور شاعر، شاعر علی شاعر نے بھی ایک خوبصورت تحریر فلیپ کے طور پر شامل کی ہے۔ تین سو چار صفحات پر مشتمل یہ کتاب جس عمدہ گیٹ اپ اور کاغذ کے ساتھ شاعر علی شاعر نے شائع کی ہے اس سے محسوس ہوتا ہے کہ غالب سرائی میں عملاً وہ بھی شامل ہو گئے ہیں۔

دیباچہ نگار ڈاکٹر فہمیدہ تبسم اس کتاب کی اہمیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں: ''مطالعاتِ غالب کے حوالے سے پروفیسر صاحب کی یہ تحقیقی کاوش نہ صرف غالب جیسے ہر عہد میں غالب شاعر کا اعترافِ عظمت ہے بلکہ غالب

فہمی کے نئے اور منفرد رجحان کا خوبصورت نمونہ بھی ہے۔ غالبؔ کی شعری و فکری قدر و منزلت کے ضمن میں منظوم کلام کی تلاش آسان کام نہیں تھا۔ اس کے لئے جس محنت شاقہ، طلب اور جستجو کی ضرورت تھی پروفیسر کلیم احسان بٹ اس کے لیے موزوں ترین مزاج کے حامل دانشور ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ غالبؔ جیسے کوئی دوسرا شاعر اپنی شعری کائنات میں اتنے امکانات سمیٹے ہوئے نہیں ہے۔ ان کے کلام پر تنقید و تحقیق کے جس کام کا آغاز مولانا الطاف حسین حالی اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے کیا تھا اس کے بعد بیسیوں محققین، ناقدین اور شارحین نے نظم و نثر کی صورت میں اسے خراجِ تحسین پیش کیا۔ پروفیسر کلیم احسان بٹ "غالبؔ سرائی" کے ذریعے اس قابلِ قدر کوشش کا ایک نمایاں حصہ بن گئے ہیں۔ اپنے پیش لفظ میں انہوں نے غالبؔ پر ہونے والے تحقیقی و توصیفی کام کا جس انداز میں ذکر کیا ہے وہ اس موضوع پر ان کے کثیر المطالعہ ہونے کا ثبوت ہے۔ اسی لیے محقق نقاد اور شاعر اکرم کنجاہی نے بھی اپنے دیباچے میں پروفیسر کلیم احسان بٹ کی کاوشوں کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے اور اس کتاب کو تنقیدی اور "غالبیاتی" حوالے سے اہم ٹھہرایا ہے۔ دیباچہ نگار سید روح الامین نے بجا طور پر کہا کہ "غالبؔ پر کوئی کتاب یا مقالہ پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ شاید اس کے بعد مزید لکھنے کی گنجائش نہ ہوگی، لیکن اہلِ نظر کوئی نہ کوئی نکتہ پیدا کر ہی لیتے ہیں۔ یوں غالب پر خامہ فرسائی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ فکر و نظر اور افکار و تصورات کے لحاظ سے غالب شجرِ سایہ دار کی صورت اختیار کر چکے ہیں تو اسے مبالغہ نہ سمجھا جائے"۔

غالبؔ پر خامہ فرسائی کے چند منتخب نمونے اس کتاب میں سے قارئین کے ذوقِ شعری کی تسکین کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں:

اقلیمِ سخن ہے ترے اعجازِ نفس سے
ہم نغمہ و ہم شیشہ و ہم نکہت و ہم رنگ

تو نظم میں بھی، نثر میں بھی مجتہد العصر
لیکن وہ ہے معذور کہ جس کی ہے نظر تنگ

جگر مراد آبادی

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا
تھا سراپا رُوح تو، بزمِ سخن پیکر ترا
زیبِ محفل بھی رہا، محفل سے پنہاں بھی رہا

علامہ اقبال رحمۃ اللہ

نوکِ خامہ ہے تری زخمۂ سازِ عرفاں
کہ نوا ریز ہے ہر صفحۂ دیواں تیرا

خلیفہ عبدالحکیم

اگر یہ سچ ہے الفاظ روح رکھتے ہیں
تو یہ بھی سچ ہے وہ الفاظ کا مسیحا ہے

دلاور فگار

غالبِ شیوہ بیاں تھے محسنِ اردو زباں
ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں جن کی عظمت کے نشاں

احمد علی برقی اعظمی

ترا کلام سند ہے زمانے بھر کے لیے
نہ کوئی جھول ہے اس میں نہ اشتباہِ خیال

باقی احمد پوری

غالبؔ یہ ایک بات مری لاکلام ہے
تیرے بغیر ذکرِ سخن ناتمام ہے

ناصر بشیر

"غالب سرائی" میں سے درج بالا منتخب کلام سے قارئین نے محسوس کیا ہوگا کہ مرزا غالبؔ ہر عہد کی طرح آج کے عہد میں بھی اسی طرح مقبول و معروف ہیں بلکہ ان کی شعری کائنات میں سے نئے معنی تلاش کیے جا رہے ہیں کہ بلاشبہ اس کی شاعری گنجینۂ معنی کا طلسم ہے۔

☆☆☆☆☆

قائم نقوی.....ایک بے مثال شاعر

ہم سب کے دوست، معروف شاعر، سابق مدیر ماہِ نو، حالیہ مدیر ادبی جریدہ، نمود با کمال شخصیت، پیکر خلوص جناب قائم نقوی ریڈیو پاکستان کے پنجابی مسالے میں اپنا کلام سنانے کے بعد اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے---

قائم نقوی اردو پنجابی کے نامور شاعر تھے، ان کی اچانک وفات کی خبر سارے پاکستان میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی، قائم نقوی کسی مخصوص ادبی گروہ کے نمائندے نہیں تھے، وہ سب سے ملتے تھے، سب سے ایک جیسی محبت رکھتے تھے، پنجاب کے شہر مظفر گڑھ کے ایک مضافاتی علاقے علی پور سے تعلق رکھنے والے قائم نقوی حصولِ رزق اور مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے لاہور آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے--- منزلوں کی جستجو میں انھیں کئی سراب بھی ملے اور راستے میں رکاوٹیں بھی آئیں بقول قائم نقوی---

جاگتے میں بھی خواب دیکھے ہیں
کیا سہانے سراب دیکھے ہیں

کتنے بیلوں کی خاک چھانی ہے
ہم نے کتنے چناب دیکھے ہیں

.....

قائم نقوی کی شاعری میں موضوعات کی کمی نہیں، وہ ہجر و وصال سے لے کر عصری سائل تمام موضوعات کو اپنی شاعری میں شامل کرتے ہیں- دو شعر ملاحظہ کریں---

وہ اپنا بوجھ ہمارے سروں پہ چھوڑ گئے
معاملے تھے دلوں کے دلوں پہ چھوڑ گئے

ہمارا قتل ہوا دفتروں کے کربل میں
ہم اپنے نقش فقط فائلوں پہ چھوڑ گئے

.....

محمد نوید مرزا

قائم نقوی ایک عمدہ شاعر تو تھے ہی، اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک کامیاب مدیر بھی تھے، تیس برس تک وہ ماہ نو جیسے بڑے ادبی جریدے کی ادارت کرتے رہے اور انھیں کامیابی ملی، محترمہ کشور ناہید صاحبہ بھی ماہ نو کی چیف ایڈیٹر رہیں اور قائم صاحب کو ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع بھی ملا---
قائم نقوی ملازمت سے ریٹائر ہو کر بھی ادبی دنیا میں فعال رہے، انھوں نے نمود کے نام سے ایک ادبی جریدہ جاری کیا اور یہ سلسلہ کئی برسوں سے جاری تھا۔ حیرت کی بات ہے کہ نمود کا آخری شمارہ شائع کر کے اسے دوستوں تک بھی پہنچا گئے--- قائم نقوی کمال شخصیت کے مالک تھے، انھوں نے ہمیشہ دوستوں میں محبتیں بانٹیں اور سمیٹیں--
وہ ایک منکسر المزاج شخصیت کے حامل انسان تھے۔ پہلی بار ملنے والا ہی ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ یہ وصف نوجوانی سے ہی ان کی طبیعت کا حصہ تھی۔ وہ ہر شخص کے لئے سراپا خلوص اور محبت تھے اور دوست بھی انھیں چاہتے تھے، یہی وجہ تھی کہ سوشل میڈیا پر ان کی وفات کی خبر آتے ہی پاکستان اور دیار غیر سے ان کی وفات پر اظہار افسوس کے پیغامات آنے شروع ہو گئے اور نماز جنازہ میں شریک ہر فرد کی آنکھ نم تھی---
قائم نقوی کی اردو، پنجابی کی کتابوں میں بیلے رمزاں دے، نطق، زاد ہجر اور دیگر کتابیں شامل ہیں، انھوں نے کئی برس تک اردو غزل کا انتخاب بھی کیا، اس کے علاوہ 'نوائے وقت' جیسے معروف اخبار میں کالم لکھے--- برسوں پہلے ان کی شاعری کے حوالے سے نامور شاعر، افسانہ نگار اور مدیر مجلّہ، فنون جناب احمد ندیم قاسمی نے لکھا تھا، قائم نقوی نئی نسل کا ایک ہونہار اور حساس شاعر ہے اس نے جدت خیال اور جدت اظہار کے بہت سے مراحل طے کر لئے ہیں اور اب ان کا شمار ان نوجوان شعرا میں ہوتا ہے جن سے اعتماد کے ساتھ امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں، قاسمی صاحب کی اس رائے کی روشنی میں قائم نقوی کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ شاعر نے مرحلہ وار ترقی کی منازل طے کیں اور ادبی دنیا میں اپنا نام اور مقام پیدا کیا۔ قائم نقوی نے اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں یکساں مقبولیت حاصل کی۔ بقول آغا سلمان باقر، قائم نقوی کی شاعری اپنی ذات میں پرت در پرت، فکری اساس کی کاملیت کا نہ صرف اظہار کرتی ہے بلکہ عہد نو کی حشر سامانیوں اور محرومیوں کے پُر آشوب مگر خیال انگیز فکری اسلوب کا سنگ میل بھی رکھتی نظر آتی ہے۔
یہی وجہ ہے کہ قائم نقوی کی غزل میں گداز ترنم کے ساتھ فکر کی بالیدگی کا پرتو بھی ملتا ہے۔ وہ زندگی کو رعنائی کے آئینے میں دیکھتے ہیں اور فکر سے روشنی کی کرن کو منعکس کر دیتے ہیں۔ اس کیفیت میں ان کی شعری

قوتیں، قوس وقزاح کے متوج اور خیال انگیز رنگ بھر دیتی ہیں اور یوں قائم نقوی کی غزل ایک منفرد اسلوب اور طرز اظہار کا نمائندہ بن کر ابھرتی ہے۔ آغا صاحب کی اس بھرپور اور قیمتی رائے کے بعد اب آیئے قائم صاحب کی شاعری سے انتخاب پڑھتے ہیں۔

اسی کے نام سے روشن ہیں آندھیوں میں چراغ
وہی ہے جو مری شامیں جمیل کرتا ہے

کب دیا بادبانوں نے اذن سفر
ساحلوں پہ کھڑی کشتیاں رہ گئیں

سوکھا ہوا پتہ ہوں چلوں ساتھ ہوا کے
سائے کی طرح کیوں تہ دیوار پڑا ہوں

مجھے اذن سفر دے کر تو دیکھو
سبھی رستے مرے دیکھے ہوئے ہیں

چھتوں کے ساتھ نہ اڑ جائیں کابکیں قائم
ہوا کے رخ پہ ہمارے بیان جاگتے ہیں

سورج اتر رہا ہے نسوں میں کرن کرن
ریزوں میں نہ ڈھل جائیں یہ پتھر پڑے پڑے

.....

شہر میں دستار کی باتیں ہوئی تھیں رات بھر
صبح ہوتے ہی کسی کا سر نشانہ ہو گیا

.....

قائم نقوی نے شاعری کی تمام مشہور اصناف حمد، نعت، سلام، غزل اور نظم میں کامیابی سے طبع آزمائی کی۔ ان کا انداز بیاں سادہ اور پراثر تھا۔

قائم نقوی ایک اعلیٰ درجے کے شاعر اور خوبصورت انسان تھے۔ ان کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے، اس مضمون کو سب دوست ایک خراج تحسین یا پرسہ بھی کہہ سکتے ہیں، اللہ پاک قائم نقوی کی مغفرت فرمائیں، آمین

آخر میں قائم نقوی کی غزل کے چند خوبصورت شعر ملاحظہ کریں۔۔

کیا کوئی دے سکے پتہ میرا
بھید مجھ پر بھی کب کھلا میرا

آنکھ کی لو میں ہے ضمیر کی لو
مجھ میں زندہ ہے رہنما میرا

خاک ہو کر روش روش لکھوں
جانے کس سمت ہو خدا میرا

گا رہا ہوں میں وقت کی لے پر
لحہ لحہ ہے آشنا میرا

ریزہ ریزہ ہوئے ہیں خواب مرے
پھر بھی قائم ہے حوصلہ میرا

☆☆☆☆☆☆

لیوٹولسٹوئی کے ناول ''اینا کیرینینا'' کا تجزیاتی مطالعہ [بقیہ حصہ]

۲۔ ''جنگ اور امن'' میں ٹولسٹوئی، ایک موٹے سے بھدے آدمی کو جو اپنی بیوی تک کے لیے قابل نفرت ہے، کیوں توجہ کا مرکز بناتا ہے؟ اور اس کے مشاہدات و احساسات میں اپنی طرف سے اضافہ کیوں کرتا ہے (گویا یہ وہی اعتراض ہے جو فلوبیئر اور ورگا کے سلسلے میں کیا گیا تھا اور جس میں ''واقعیت'' کی پوری تحریک شریک ہے۔)

۳۔ ''رستا خیز'' نام کے ناول میں، ٹولسٹوئی فنکاری کو قطعاً ترک کر کے ایک مبلغ محض بن کے رہ جاتا ہے (اس مرحلے پر تو اس نے خود ''اینا کارینینا'' تک لکھنے کو ایک بے کار کا شغل بتایا تھا) یہاں وہ کرداروں کا ایک ایسا جوڑا بناتا ہے جن میں کوئی جوڑ نہیں، ماسوا جذبۂ رحم، کے جو بے حد سطحی اور مبلغانہ معلوم ہوتا ہے۔'' (۲۵)

ان میں سے تیسرے اعتراض کے سلسلے میں، تنقید کی رائے عامہ، لارنس کے ساتھ ہے کہ ''رستا خیز'' واقعی ایک کمزور، ناقابل دفاع قسم کی تبلیغاتی تحریر ہے۔ مگر ''جنگ و امن'' کے پیئر کو ہیرو سمجھنے کے بجائے ایک دیدیان، یا مشاہدۂ زمان و مکان کا ایک ذریعہ سمجھا جائے اور اس کی خانگی زندگی کو نپولین کے حملے سے پہلے کے روس کی ایک نمائندہ تصویر، تو اعتراض کی گنجائش بہت کم رہ جاتی ہے۔ ایک ایسے دور میں جب کہ پوری قوم زندگی اور موت کی جنگ لڑنے میں مصروف ہے، پیئر کی مضحکہ خیزی شہزادہ آندرے کے مقابلے میں اور بھی زیادہ ابھر کے سامنے آتی ہے اور لارنس کو جس کا ذہن بنیادی طور پر جدلیاتی ہے، یہ تقابل نظر انداز نہیں کرنا چاہیے تھا۔

باقی رہا ''محافظ دستے کا افسر'' ورونسکی جو کہتا ہے کہ ''میں بطور انسان تو ختم ہو چکا ہوں مگر افسر کے طور پر شاید اب بھی کارآمد ثابت ہو سکوں'' تو یہ محض رائے عامہ سے خوف کی بنا پر نہیں کہا جا سکتا۔ یہاں صرف اوپیراہاؤس کے ناظرین کا قصہ نہیں، پارٹیوں کے دعوت نامے وصول نہ ہونے کا مسئلہ نہیں، یہاں ورونسکی کی ماں اور اس کی آرزو بھی ہے (جو لارنس کی ماں اور اس کی آرزو سے مختلف ہے) یہ ماں ایک نواب زادی ہے اور اپنے بیٹے کے ''جواں مردانہ مستقبل'' کے

نبیل احمد نبیل

بارے میں فکر مند۔ پھر وہ رونسکی خود محسوس کرتا ہے کہ تاریخ کے اس لمحے میں وہ کوئی کارنمایاں انجام دے کے اپنی کھوئی ہوئی عزت کو بحال کرسکتا ہے۔ لیوس نے البتہ لارنس کی جرمن نژاد بیوی میں فریڈا کو جو خود ایک نواب زادی تھی اور اپنے پروفیسر شوہر کے پاس، ایناکے مقابلے میں، ایک کی جگہ تین بچے چھوڑ کر لارنس کے ساتھ نکل آئی تھی، ایناکے بجائے ایناکے لاابالی اور خوش باش بھائی سیتوا سے مشابہ قرار دیا ہے، مگر اس نے جس طرح لارنس کا زندگی بھر ساتھ دیا، وہ سیتوا سے ممکن نہ تھا اور نہ اس مشابہت سے لارنس کے اعتراض کی گہرائی یا سطحیت پر کوئی روشنی پڑتی ہے۔

لارنس سمجھتا تھا کہ ٹولسٹوئی کو درونسکی کی کامیابی پر حسد پیدا ہوا اور اس نے اسے اندر سے کمزور کردیا۔ یہ لارنس کا وہم تھا اور ٹولسٹوئی نے مبلغ بن جانے پر ایک قسم کا طعنہ! (یوں تو چیخوف نے بھی ٹولسٹوئی سے فن کی طرف لوٹنے کی گزارش کی تھی مگر یہاں اور وہاں لہجے کا بہت فرق ہے، اگرچہ صورت حال سے بے اطمینانی دونوں کو ہے)۔ بہت پہلے اس نے ٹولسٹوئی کی مابعدالطبیعیات کو ہارڈی کی مابعدالطبیعیات کی طرح کمزور قابل رحم اور بے ڈھنگی قرار دیا تھا، ناول کی حیاتی صداقت کے راستے میں ایک رکاوٹ۔ مگر ٹولسٹوئی کی صورت حال، ہارڈی سے بے حد مختلف تھی۔ وہ پہلے پہل ایک مردِ عمل تھا، پھر ایک فن کار ہوا اور آخر میں مبلغ بن بیٹھا۔ چناں چہ اس کے اعلیٰ فنی کارنامے جہاں ایک طرف دنیائے عمل سے پیوست ہیں، وہاں ان میں آہستہ آہستہ پیغام کا تناسب بڑھتا جاتا ہے، یہاں تک کہ آخر میں فن بالکل غائب ہو جاتا ہے، اس حد تک کہ وہ ''اینا کارینینا'' لکھنے پر شرم سار ہوتا ہے اور شیکسپیئر کو نذر آتش کردینا چاہتا ہے۔ یہاں لارنس کی تنقیدی سمت تو صحیح ہے مگر فنی کمال کے سامنے بالخصوص ''اینا کارینینا'' ایسے بڑے المیے کے مقابل، لارنس ایسے ناقد سے توقع ہوتی ہے کہ مبلغ ٹولسٹوئی سے قرب زمانی کی وجہ سے جذباتی منافرت کا شکار نہیں ہو جائے گا مگر افسوس کہ ہوا۔

اس کے باوجود، ناول اس کی نظر میں کسی بھی تبلیغاتی پروگرام، کسی بھی اولیائی تعلیم سے بالاتر ایک چیز کا نام ہے اور یہ کہ ناول ہی ایک روشن کتاب زندگی ہے امریکی وکیل روبن شائن نے ''لارنس اور قانون'' پر لکھتے ہوئے اسے ایک ڈینگ قرار دیا ہے اور دوسری طرف ایک نئے امریکی ناقد، الفریڈ کازین نے جدید ناول پر اپنی تصنیف کا عنوان یہیں سے حاصل کیا ہے اور لارنس کی نظر میں، ناول، اگر یہ فن ہو اور فنکار کی رگوں میں محسوس کیے ہوئے فلسفے کا حامل، تو جملہ کمالات انسانی میں ایک بہت بڑے مرتبے کا مالک ہے، محض اس وجہ سے نہیں کہ وہ خود ناول نگار ہے اور دون کی لے رہا ہے، بلکہ اس لیے کہ جو چیز آپ ایک ناول سے حاصل کرسکتے ہیں، وہ آپ کو کہیں سے نہیں مل سکتی۔ ٹولسٹوئی کا ''جنگ و امن''

نپولین کے بارے میں، فن حرب کے بارے میں، تاریخ کے تصور پر اور خود روس کی سماجی زندگی پر لکھی ہوئی کتابوں کی ایک پوری لائبریری پر بھاری ہے، اسی طرح دستوئیفسکی کا ''کارا مازوف برادران'' تجزیہ نفس کے بنیادی مکتب خیال کا ایک لازمی ماخذ ہے۔ نٹشے جیسے فلسفی نے کہا ہے کہ انسانی نفسیات کے بارے میں جو کچھ بھی مجھے سیکھنا تھا مجھے دستوئیفسکی سے حاصل ہوا۔ خود لارنس کے ناولوں میں ''قوس قزح'' اور ''عورتیں محبت میں'' (Women in Love) ایسی انسانی دستاویزیں ہیں کہ اپنے زمانے سے، اپنے ملک سے، اپنی زبان اور اس کی ادبی تاریخ... سب سے بالا ایک دائمی انسانی اہمیت کی حامل ہیں۔

کچھ ایسی ہی کیفیت لارنس کی تنقید میں بھی ملتی ہے۔ اسے محض ایک ناقد کہہ کے ٹالا نہیں جاسکتا مگر ہم لارنس کے تنقیدی عمل سے پنجہ آزمائی میں مصروف ہیں اتنی دور تک نہیں جاسکتے۔ اپنے امریکی مطالعات پر اس نے پانچ برس صرف کیے، پھر بھی ایک امریکی پاکٹ ایڈیشن میں اس کا مجموعی سائز دو سو صفحوں سے کم ہے۔ اس تنقید میں ایسی جزالت ہے کہ ایک آدھ مصنف مثلاً ایمرسن اور مارک ٹوین کو چھوڑ کر (جن پر لارنس نے دوسری جگہ لکھ کر کمی پوری کردی ہے) امریکہ کے تمام اہم اور بہت سے کم اہم لکھنے والوں کی شہکار کتابوں کے نہایت عمدہ تجزیے اس میں موجود ہیں اور اس پر طرہ یہ کہ امریکی نظام اور سماج اور تاریخ پر ایسی ژرف نگاہی سے نظر ڈالی ہے کہ فن تنقید کی رسائی کا بھی صحیح معنوں میں احساس ہوتا ہے۔ امریکی ناقد پول روزفیلڈ کے خیال میں ''امریکی ادب اور زندگی کے بارے میں ایسی گہری کتاب تو آج تک کسی امریکی مصنف نے بھی نہیں لکھی... اور وہ بھی امریکہ جیسے بڑے ملک میں چند ماہ کے قیام کے بعد... ان مضامین کا خوش گوار تمسخر آمیز لہجہ ہی ایک دیوقامت ادیب کی تخیلاتی بصیرت کے لیے جو ایک پورے براعظم پر محیط ہے، آدھے راستے کو طے کرنے کا باعث بن جاتا ہے''۔(۲۶)

ٹالسٹائی کے ناول ''اینا کارینینا'' کے ہیرو ورونسکی نے گناہ کیا، کیا نا؟ پھر بھی یہ گنہگاری ایک ایسا نقطہ کمال تھا جس کی آرزو پوری عقیدت کے ساتھ کی جاسکتی ہے۔ ناول سے یہ اچھی طرح کھل جاتا ہے۔ لیوٹالسٹائی کے مجاتماپن کے باوجود اور اس کے ''رستاخیز'' کا تقدس مآب شہزادہ تو ایک بونگا ہے جس کے تقدس کی نہ کسی کو ضرورت ہے نہ احترام۔

یہیں سے ناول کی بڑائی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ یہ آپ کی ناصحانہ دروغ بیانی کو چلنے نہیں دیتا۔ جب ورونسکی، اینا کارینینا کو پا لیتا ہے تو کون ہے جو طمانیت کے سوا کوئی اور جذبہ محسوس کرے؟ پھر گناہ بھی کیسا؟ دیکھیے تو سارا المیہ یہیں سے پیدا ہوتا ہے کہ ورونسکی اور اینا، سماج سے خوفزدہ ہیں۔ ان کا شیطان سماجی تھا، تناسلی ہرگز نہ تھا۔ وہ اپنے

دیانت دارانہ ولولے کے غرور میں زندہ نہ رہ سکتے اور ان سے (معاشرتی، اخلاق کی محافظ) بڑی بوڑھیوں کی آنکھ میں تھوکا نہ گیا۔ یہی بزدلی ان کا اصلی گناہ تھا۔ ناول اس حقیقت پر سے پردہ ہٹا دیتا ہے۔ اور مہاتما ٹولسٹوئی کی غیر تخلیقی تبلیغ کا دندان شکن ردعمل فراہم کرتا ہے۔ ''ایک افسر کے طور پر میں اب بھی کار آمد ہوں مگر ایک انسان کے طور پر برباد ہو چکا ہوں''۔ (۲۷) ورونسکی یہ کہتا ہے کہ اسی قسم کی بات کوئی پستی سی پستی ہے کہ آدمی اور مرد کے طور پر تو کوئی ڈھے جائے مگر سماجی پرزے کے طور پر باقی رہ جائے اور وہ بھی محض ایک افسر کے طور پر۔ خدا کی پناہ! اور بس اس لیے کہ اوپیرا گھر میں لوگ ان کو دیکھ کر پیٹھ کر لیتے ہیں گویا ان لوگوں کی پیٹھ ان کے چہروں سے بہر حال بہتر نہیں ہوتی۔

بوڑھے مہاتما جی یہ اپدیش دینا چاہتے ہیں کہ یہ سب تناسلی گناہ یا لنگم پاپ کی وجہ سے ہوا۔ دروغ گو بوڑھا! اس لیے کہ تناسلی یا لنگم گھات کے بغیر خود اس بوڑھے کی کتابیں کہاں ہوتیں؟ اور پھر لہو کے اس ستون کو الزام دینا جس نے زندگی کی سب دولتیں اس کو بخشی ہوں۔ ایک خارش زدہ لہو نچڑے سماج سے دبک کر رہ جانا اور اس پلید بڑھیا (میڈم گرنڈی۔ اخلاقی اجارہ داری کی مثال) کو مسیحی اخوت کی نئی ٹوپی پہنا کر اور سرخی پوڈر سے لیپ پوت کر پیش کرنا۔ ایسے اخی تو کسی آختہ باپ ہی کی اولاد ہو سکتے ہیں۔

خود ناول ورونسکی کی پیٹھ پر ایک لات رسید کرتا ہے اور بڈھے لیو کے دانت نکال کے رکھ دیتا ہے اور ہمیں جو کچھ جاننا چاہیے جاننے دیتا ہے۔

آپ کسی بھی دوسرے وسیلہ فن کو جل دے سکتے ہیں۔ آپ ایک نظم کو پوپ پرستوں کا جعلی تقدس دے سکتے ہیں اور پھر بھی یہ نظم ہی رہے گی۔ ڈرامے کے اندر آپ ایک ہیملٹ کو ڈال سکتے ہیں مگر ناول میں ایسا کوئی کردار ہوتا تو نیم مسخرہ ہو جاتا، نہیں تو کسی حد تک مشتبہ دستوفسکی کے ''مجنوط الحواس'' کی طرح۔

اور اب ہم ناول کے عظیم اور قابل تحسین اوصاف کو دیکھتے ہیں۔ یہ جاندار ہوئے بغیر وجود نہیں رکھ سکتا۔ ایک عام قسم کا بے جان ناول چاہے وہ کتنا ہی مقبول عام کیوں نہ ہو جائے۔ بالآخر مطلق طور پر مرگ عدم میں غائب ہو جاتا ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ مثلاً (ٹالسٹائی کے) ''جنگ و امن'' کا پیئر، شہزادہ آندرے کی نسبت زیادہ غبی اور کم جان دار ہے۔ پیئر بعض چیزوں کے ساتھ کافی عمدگی کے ساتھ مربوط ہے، خیالات منجن، خدا، لوگ، کھانا، گاڑیاں، ریشمی ٹوپیاں، مصیبت، اسہال، ستارے۔ مگر اس کا رشتہ برف باری اور دھوپ کے ساتھ، بجلی، بلیوں اور لنگم کے ساتھ، فوشیا کے

پھولوں اور جائے ضرور کے کاغذ کے ساتھ کسی قدر کا ہلانہ اور غلط ملط سا ہے۔ وہ اتنا جان دار ہے نہیں۔

حقیقی طور پر جان دار لوگوں کے بارے میں ٹولسٹوئی کو بہت شوق ہے کہ ان کو ختم یا پھر غلط ملط کر دیا جائے ایک سچے بالشویکی کی طرح۔ یہ احساس ناگزیر ہے کہ نتاشا پیئر کے ساتھ ازدواج کے بعد خود بھی غلط ملط اور تازگی سے محروم ہو چکی ہے۔

پیئر وہ چیز تھا جسے ہم کہتے ہیں ''اتنا انسان!'' جس کا مفہوم ہے۔ ''اس قدر محدود'' بنی آدم ایک دوسرے کے ساتھ چپکے ہوئے، اپنی انفرادی زیر باریوں کو محدود کرنے کے لیے، اسی کو ''انسانیت'' کہا جاتا ہے اور یہی پیئر ہے اور یہی ٹولسٹوئی بھی ایک فلسفی کے طور پر جو اپنے بارے میں بے زار کن قسم کے مسیحی اخوت کے خیالات کا حامل ہے۔ آخر بنی آدم کو مسیحی اخوت تک محدود کیا جائے۔

یہی آدمی ہے اور ٹولسٹوئی بھی فی الحقیقت یہی کچھ تھا، لینن تک یہی کچھ تھا۔ مسیحی اخوت کی مشین میں خدا کی ہستی جو انسانوں کو کاٹ پیٹ کر چٹ پٹے کباب بنا کر رکھ دیتی ہے۔

بلاشبہ ٹولسٹوئی ایک عظیم تخلیقی فنکار ہوتے ہوئے اپنے کرداروں کے ساتھ صادق تھا۔ مگر صاحب فلسفہ ہوتے ہوئے وہ خود اپنے کردار کے ساتھ صادق نہیں تھا۔

کردار ایک حیرت انگیز چیز ہے۔ ایک دہکتا ہوا شخصی شعلہ، روشن یا تاریک تر، کم یا زیادہ نیلگوں، زرد یا سرخ، اُبھرتا ڈوبتا، جھلکتا ہوا، حالات کی تشنگیوں اور زندگی کی ہواؤں کے مطابق پیہم تبدیل ہوتا ہوا، پھر بھی ایک واحد اور جداگانہ شعلہ رہتے ہوئے ایک اجنبی دنیا میں جھلملاتا ہوا، اگر یہ بالآخر کسی بہت بڑی پتا کی وجہ سے بجھ کر نہ رہ جائے۔ اگر ٹولسٹوئی اپنے ہی باطن کے شعلے پر نظر ڈالتا تو اسے دکھائی دیتا کہ خود اس کو وہ چربی چڑھا، بدحواس پیئر فی الحقیقت پسند نہیں تھا بلکہ اسے ایک اچھا آلہ کار بھی نہیں کہا جا سکتا۔ مگر ٹولسٹوئی ایک کردار سے زیادہ ایک شخصیت تھا اور شخصیت ایک خود نگہدار قسم کی ''میں ہوں'' کا نام ہے اس لیے کہ شخصی خدا کا جو بھی قادر مطلق تھا، یہی ایک جز ہمارے اندر باقی رہ گیا ہے۔ لہٰذا ایک شخصیت اور قادر مطلق قسم کی، میں ہوں، کے بل پر لیو نے ارادی کوشش سے شیر بنانے'' کی آرزو کی جب کہ وہ ایک پالتو قسم کا خانہ پر ور کتا تھا، مگر اس ناخنوں سے شکار کرنے والے لیو کے لیے کیسی بے حرمتی کی بات ہے اور اپنے ناولوں میں آپ کسی کو یہی کام کرتے ہوئے دیکھتے ہیں، یہاں تک کہ ''رستا خیز'' کے کاغذی ہونٹ سرگوشی کرنے لگتے ہیں۔

''میں ایک ناول بن سکتا تھا مگر لیو نے مجھے خراب کر دیا''۔ (۲۸) کاؤنٹ ٹولسٹوئی میں ایک عظیم آدمی کی وہ آخری کمزوری تھی! وہ مطلق حقیقت کا آرزومند تھا۔

Anna Karenina is not a

resolution and coexist only in a fragile equilibrium." (29)

اینا کیرینینا ایک نہیں بلکہ کئی مرکزی خیالوں کا احاطہ کرنے والا ناول ہے ہم آسانی سے قیاس کر سکتے ہیں کہ ٹولسٹوئی نے اپنے لیے اور اپنے قارئین کے لیے زندگی، خواتین اور مردوں کے متعلق اپنی معلومات کا اعادہ کرنا چاہتا تھا تاہم اِس عظیم تلخیص میں ہمیں تزکیہ نفس یا مسائل کے منطقی انجام تک پہنچانا نظر نہیں آتا۔ جیسا کہ اینا کی مایوسی شدت اختیار کرتی ہے بلکہ اُس کے محسوسات اُس کی خودکشی سے پہلے منتشر ہوتے ہیں، اُس لمحے ٹولسٹوئی کا زندگی سے متعلق وسیع تر نقطہ نظر اور بھی گہرا اور تیز تر ہو جاتا ہے اور چوں کہ ٹولسٹوئی فنی لحاظ سے اپنی بصیرت کو مزید آسان بنانے کی فکر نہیں رکھتا، اِس بنا پر اینا کارینینا کے بہت سے مرکزی خیال کسی ایک نقطہ انجام پانے سے گریزاں ہیں اور ایک کمزور توازن کی صورت معلق رہتے ہیں۔

book with a single theme, but many themes. We can easily assume that Tolstoy wanted to recapitulate for himself and for his readers everything that he knows about men, women and life.... In this great summing -up, however, there is no catharsis, no resolution. For just as Anna`s despair intensified but distorted her sensibilities just before her suicide, the edge of crisis and conversion sharpened and deepened Tolstoy`s already comprehensive vision of life. And because Tolstoy was morally and artistically no longer capable of simplifying that vision, the many themes of Anna Karenina resist

حوالہ جات

1- Anna karenina, Translated edition. Victor Shklovsky and Olga Shartse. (Progress publlshers, soviet socialist Republics, 1978.p.426.)

2- Gifford , Henry, Tolstoy (Oxford University Press, Oxford, 1982.p.48.)

۳- لیوٹالسٹائی، انا کیرینینا، مترجم: تقی حیدر، لاہور، تخلیقات، ۱۹۹۸ء، ص ۶۵

۴- لیوٹالسٹائی، انا کیرینینا، مترجم: تقی حیدر، لاہور، ص ۱۴۴

۵- لیوٹالسٹائی، انا کیرینینا کارینینا، مترجم: تقی حیدر، لاہور، ص ۷۳، ۱۱۷

6-Nabokov,Vladimir.(1981). Lecture on Russian Literature. New York: Harvest.pp.137,183.

لیوٹالسٹائی، انا کارینینا، مترجم: تقی ۷- حیدر، لاہور، ص ۵۶

۸- لیوٹالسٹائی، انا کارینینا، مترجم: انعام الحق، لاہور، چودھری فضل حق پبلشرز، ۱۹۶۶ء، ص ۵۴۱، ۵۵۰، ۵۶۱

۹- لیوٹالسٹائی، انا کیرینینا، مترجم: تقی حیدر، لاہور، ص ۳۷

۱۰- لیوٹالسٹائی، انا کیرینینا، مترجم: تقی حیدر، لاہور، ص ۶۳۵

۱۱- لیوٹالسٹائی، انا کیرینینا، مترجم: تقی حیدر، لاہور، ص ۷۶۴

۱۲- لیوٹالسٹائی، انا کیرینینا، مترجم: تقی حیدر، لاہور، ص ۷۶۱

۱۳- لیوٹالسٹائی، انا کیرینینا، مترجم: تقی حیدر، لاہور، ص ۳۶۶

۱۴- لیوٹالسٹائی، انا کیرینینا، مترجم: تقی حیدر، لاہور، ص ۴۴۱

15- Gifford, (ed) Leo Tolstoy (Penguin Critical Anthologies, Harmondsworth , 1971.p.301) .

۱۶- لیوٹالسٹائی، انا کیرینینا، مترجم: تقی حیدر، لاہور، ص ۳۰

۱۷- لیوٹالسٹائی، انا کیرینینا، مترجم: انعام الحق، لاہور، چودھری فضل حق پبلشرز، ۱۹۶۶ء ص ۳۱

۱۸- لیوٹالسٹائی، انا کیرینینا، مترجم: تقی حیدر، لاہور، (ایضاً)

۱۹- لیوٹالسٹائی، انا کیرینینا، مترجم: انعام الحق، لاہور، چودھری فضل حق پبلشرز، ۱۹۶۶ء ص ۷۸

۲۰- لیوٹالسٹائی، انا کیرینینا، مترجم: انعام الحق، لاہور، چودھری فضل حق پبلشرز، ۱۹۶۶ء ص ۵۴۰

۲۱- لیوٹالسٹائی، انا کیرینینا، مترجم: انعام الحق، لاہور، چودھری فضل حق پبلشرز، ۱۹۶۶ء ص ۵۷۱

۲۲- محمد مجیب - روسی ادب (جلد دوم) کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۲ء ص ۲۶۹، ۲۷۹

Crego.Women in Tolstoy. Urbana: University of Illinois Press, 1973

Translations

* Anna Karenina, Translated by Constance Garnett. (1901) Still widely reprinted
* Anna Karenina, Translated by Richard Pevear and Larissa Volokhonsky (Allen Lane / Penguin, London, 2000.)
* Anna Karenina, Translated by Margaret Wettlin (Progress Publishers, 1978.)
☆لیو طالسطائی ، جنگ اور امن، مترجم : شاہد حمید، لاہور، پولیمر پبلی کیشنز، (جلد اوّل ۱۹۹۳ء، جلد دوم ۱۹۹۴ء)
* "Anna Karenina" Translated by Richard Peveas and Larissa Volokbonsky, Penguin Books 2000.

☆☆☆☆☆

۲۳- لیوٹالسٹائی، انا کیرینینا، مترجم: انعام الحق، لاہور، چودھری فضل حق پبلشرز، ۱۹۶۶ء ص ۵۲۷
24- Leavis ,F.R. Anna Karenina and other essays .(Chatto and Windus, London, 1967.p.16)
25- Lawrence, D. H. (1955). D.H. Lawrence's response to Russain Literature . London , Chatto and Windus Publications. p.12
26- Gifford , Henry(ed) Leo Tolstoy. (Penguin Crictical Anthologies, Harmondsworth , 1971. p.98.)
۲۷- لیوٹالسٹائی، انا کیرینینا، کارینینا مترجم: انعام الحق، لاہور، چودھری فضل حق پبلشرز، ۱۹۶۶ء ص ۵۲۷
28- Lawrence, D.H. (1955). D.H. Lawrence's response to Russain Literature. London , Chatto and windus publications. P. 18
29- Benson, Ruth

بے ساختہ دل میں اترنے والا شاعر: ناصر بشیر

پروفیسر ناصر بشیر کا تعلق لاہور سے ہے وہ دیال سنگھ کالج لاہور میں اردو ادب کے استاد ہیں اور مسلسل اپنی شاعری، تبصرہ نگاری، تنقید سفرناموں اور کالموں کے ذریعے سے اردو ادب کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس سلسلے سے ان کو جہاں متعدد اعزازات وانعامات سے نوازا جا چکا ہے وہیں ان کی کئی کتابیں بھی منظرِ عام پر آ چکی ہیں، جس میں ان کا مجموعۂ کلام ''منظر بدل گئے'' نہایت اہمیت کا باعث ہے۔ جس کے لیے احمد ندیم قاسمی، عرش صدیقی، ظفر اقبال، خالد احمد، روحی کنجاہی، عباس تابش اور شہزاد احمد جیسے معروف قلمکاروں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، جس سے ان کی شعری فکر، ان کا اسلوب اور ان کے یہاں آئی ہوئی لفظیات کی اہمیت وعظمت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں راقم الحروف کی بھی یہ سعی رہے گی کہ ان کی شاعری پر اپنے فہم وادراک کے مطابق مختصراً گفتگو کی جائے۔

پروفیسر ناصر بشیر کی شاعری پر اگر اظہارِ خیال کرنا ہے تو سب سے پہلے یہ سمجھنا ہوگا کہ ان کے عہد میں شاعری کس فضا میں سانس لے رہی ہے؟ چونکہ کسی بھی عہد کا شاعر اپنے عہد کے ادبی تقاضوں اور ماحول سے روگردانی نہیں کرسکتا۔ وہ اسلاف سے فیض حاصل کرتے ہوئے نئے زمانے کے تقاضوں کا مکمل خیال رکھتے ہوئے اپنے فن کا محل تعمیر کرتا ہے۔ اس سلسلے سے اگر ہم آج کی شاعری پر غور کریں تو ہمیں بخوبی اندازہ ہوگا کہ ہمارے دور کی شاعری ماضی کی شاعری سے بہت حد تک مختلف ہے۔ مثلاً غزل کے حوالے سے گفتگو کی جائے تو ہم جانتے ہیں کہ ایک زمانہ وہ تھا جب غزل میں مشرقی فضا بامِ عروج پر تھی عرب اور فارس سے آئی ہوئی تلمیحات، استعارات، تشبیہات اور لفظیات سے اس کا گہرہ تعلق تھا لیکن رفتہ رفتہ غزل کی رنگت میں نکھار آتا گیا اور اس میں جہاں حسن وعشق کا تذکرہ تھا وہیں ترقی پسند شعرا نے اس کو عوام سے زیادہ سے زیادہ جوڑنے کی کوشش کی لیکن جب غزل کا یہ لہجہ بھی بے لطف نظر آنے لگا تو نئی غزل نے اپنے فن کا لوہا منوایا اور اس کے تحت نئی لفظیات، نئی تشبیہات، نئے استعارے اور نئی علامتیں وجود میں آئیں لیکن ایسا بھی نہیں ہوا کہ ہر نئے غزل گو نے روایت کو اٹھا کر طاق پر رکھ دیا ہو بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جدید شعرا کی شاعری کی

سید بصیر الحسن وفا نقوی

بنیاد میں روایت کی پاسداری شامل تھی چاہے وہ شعوری ہو یا لاشعوری طور پر۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ کچھ شعرا نے اپنی کاوشوں میں روایت کو زیادہ سے زیادہ فراموش کرنے کی کوشش کی تو بعض نے روایت اور جدیدیت کو شیر و شکر کرتے ہوئے اپنے اسالیب کا مظاہرہ کیا۔ ایسے شعرا جنھوں نے نئی آب و ہوا اور غزل کے نئے ماحول میں بھی روایت کو ساتھ رکھا ان میں پروفیسر ناصر بشیر پیش پیش نظر آتے ہیں۔ انھوں نے جہاں نئی غزل کی آبرو رکھی وہیں روایت کو بھی فراموش نہیں کیا۔ ان کے یہاں غزل آزاد فضا میں سانس لینے کا عمل انجام دیتی ہے چاہے وہ روایتی مضامین یا لفظیات سے ہم آہنگ ہو یا نئی غزل کی مظہر ہو۔ مثلاً روایتی لفظیات سے مملو ان کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

بھٹکتے پھرتے ہیں، یہ آس پاس منزل کے
بفیضِ راہبراں، قافلے ہیں، بہکے ہوئے

یہ جو ہنستے ہیں مری چاک گریبانی پر
لوگ کچھ کچھ مجھے لگتے ہیں یہ دیوانے سے
چھوڑ دو مجھ کو مرے حال پہ اے چارہ گرو!
اور دیوانہ میں ہو جاؤں گا سمجھانے سے

دیا نہیں ابھی ساقی نے اذنِ مے نوشی
وگرنہ سامنے رکھے ہوئے ہیں پیمانے

پی کر بھی کیے جاتا ہے رندوں کی ملامت
واعظ! تجھے پینے کا قرینہ نہیں آیا

سرقۂ دردِ تہہِ جام میں پکڑے جائیں
محتسب! ہم کسی الزام میں پکڑے جائیں

ان اشعار کی قرأت سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ناصر بشیر روایت سے ہٹ کر شاعری کی راہ نہیں نکالتے۔ ظاہر ہے رہبر، چارہ گر، دیوانہ، ساقی، مے نوشی، رند، واعظ، جام، محتسب جیسے الفاظ کو جس طرح روایتی شاعری میں پیش کیا گیا آج وہ زور اور وہ لہجہ معدوم نہیں تو خال خال ہی ملتا ہے۔ ان الفاظ کے تانے بانے کے ساتھ مضامین کو عصرِ حاضر میں پیش کرنا آسان نہیں اور وہ بھی کسی نئے ذہن کے متحمل شاعر کے لیے۔ لیکن پروفیسر ناصر بشیر کو یہ فن اچھی طرح آتا ہے کہ روایت یا فرسودہ لفظیات میں بھی تازہ کاری کس طرح پیدا کی جا سکتی ہے۔

ان کے یہاں نئی غزل کا جو انداز ہے وہ بھی انھیں شعرا کی بھیڑ میں ممتاز کرتا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان کی غزل میں پیچیدگی نہیں بلکہ سادگی و سلاست کی عمدہ مثالیں مل جاتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے اپنے گرد و پیش کا مشاہدہ نہایت گہری نگاہوں سے کیا ہے اور یہ خوب جانتے ہیں کہ کس مضمون کو کس طرح کہنا ہے اور اسے کون سے الفاظ کا جامہ پہنانا ہے مثلاً:

بدھ بھی گزر گیا ہے جمعرات آ گئی
اس نے کہا تھا لوٹ کے آؤں گا پیر تک

جنوری میں کبھی دسمبر میں
ذکر تیرا تمام سال رہا

جو میں نے اس سے کہا "مل کبھی اکیلے میں"
تو اس نے دھیرے سے اک لفظ کہہ دیا "پاگل"

اے شہریار! میرا تو دامن تھا چھید چھید
اچھا ہوا کہ میں ترے در پر نہ آ سکا

ان اشعار میں بدھ، جمعرات، جنوری، دسمبر، پاگل اور چھید جیسے الفاظ اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ تصنع

یا بناوٹ سے دور ہیں۔ یعنی وہ ضرورت پڑنے پر جو لفظ چاہتے ہیں برجستہ استعمال کر لیتے ہیں۔
نئی غزل میں جہاں ایک خاص قسم کی بے باکی اور بے خوف وخطر بات کہنے کا انداز پایا جاتا ہے وہیں اس کی علامتیں بھی اپنی انفرادیت کی متحمل ہیں اور یہ علامت اس وقت اور جاذبیت سے پُر ہو جاتی ہیں جب انھیں برتنے کا سلیقہ شاعر کو آتا ہے۔ پروفیسر ناصر بشیر کے یہاں ایسا نہیں ہے کچھ اچھوتی علامتوں کی نمود ہو بلکہ ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنے دور میں ایسی علامتوں کا انتخاب کیا جو نہایت مستعمل ہیں اور تقریباً ہر نیا شاعر انھیں استعمال کر چکا ہے یا کر رہا ہے مثلاً ہوا، چراغ، شجر، خشک ٹہنی، چاند، پرند سورج وغیرہ وغیرہ لیکن پروفیسر ناصر بشیر نے ان علامتوں کے ذریعے سے اپنی شناخت قائم کی ہے اور ان کے اندر ایک مخصوص قسم کی توانائی اور جاذبیت نظر آتی ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ہوا کو مائلِ پیکار کر دیا کس نے
چراغ برسرِ دیوار دھر دیا کس نے

.....

گھنے اشجار بھی رستے میں آئے
مگر ہم ہیں کہ بس چلتے گئے ہیں

.....

خشک ٹہنی پہ گلِ تر بھی تو ہو سکتا ہے
ایک دریا، مرے اندر بھی تو ہو سکتا ہے

.....

اپنی آنکھوں کو میں چھوڑ آیا ہوں چھت پر ناصر
چاند کا کیا ہے؟ کسی وقت نکل سکتا ہے

جب ان کو چاہیے ہوتا ہے ہمنوا کوئی
تو چہچہاتے پرندے، مجھے بلاتے ہیں

.....

اک اور اینٹ گر گئی دیوار عمر کی
ہر روز مجھ سے ڈوبتا سورج کہا کرے

.....

اوپر جن علامتوں کا ذکر کیا گیا ہے اگر ان کی کارفرمائی کو ان اشعار میں دیکھا جائے تو ہمیں پروفیسر ناصر بشیر کے یہاں بھرپور تازہ کاری کا احساس ہوگا۔ چونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب کوئی رجحان وجود میں آتا ہے تو بیشتر شعرا کے یہاں قدم قدم پر یکسانیت اور سپاٹ لہجہ نظر آتا ہے اگر کسی کا شعر کسی دوسرے شاعر کے نام کر دیا جائے تو اس میں کوئی تعجب خیز بات نہیں ہوتی کیوں کہ کم وبیش ایک سی علامتوں کو ایک سے پیرائے میں برتا جانا ایک عام بات ہو چکی ہے لیکن پروفیسر ناصر بشیر نے ان علامتوں کے برتنے میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے ان کے یہاں کسی دوسرے شاعر کی تقلید نہیں بلکہ اس سلسلے میں برتی ہوئی علامتیں ان کے مخصوص لہجے کی نمائندگی کرتی ہیں۔
عصرِ حاضر میں وہ شاعر نہایت کامیاب ہے جو عمیق مطالعہ اور ذہنِ رسا اور بلند پروازِ تخیل کے ساتھ اپنے دور کے مسائل کا بہترین انداز میں ذکر کرتا ہے۔ موصوف یہاں بھی دیگر شعرا سے ممتاز نظر آتے ہیں وہ اپنے ماحول میں جو کچھ دیکھتے ہیں بغیر کسی تردد کے پیش کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ شعر ہے:

کیا کچھ بنامِ عدل یہاں ہو نہیں رہا
جو فیصلے کیے گئے اکثر بدل گئے

.....

یعنی وہ موجودہ دور کے عدل و انصاف پر انگلی اُٹھاتے ہیں اور عصرِ حاضر کے انصاف کے طور طریقوں کو صحیح نہیں جانتے۔

وہ لوگوں کی حق تلفی پر بھی آواز بلند کرتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ اگر کسی انسان سے اس کا حق چھینا جا رہا ہے تو حق چھیننے والا معزز و معتبر ہرگز نہیں ہو سکتا اور محروم شخص کو بھی چاہیے کہ وہ کسی گمان میں نہ رہے۔ شعر ہے:

مرے وجود پہ اترا ہے تشنگی کا عذاب
مگر یہ زعم کہ کتنا قریب دریا ہوں

.....

عصرِ حاضر کے بہت سے مسائل ہیں اور ہر نیا شاعر اپنے اپنے طریقے سے ان کو اپنی شاعری میں پیش کرتا ہے۔ پروفیسر ناصر بشیر بھی ان مسائل کو اپنی شاعری میں جگہ دیتے ہیں۔ مثلاً آج کے دور میں عالمی پیمانے پر منافقت اور انتشار ایک بڑا مسئلہ ہے۔ جسے ہر ملک اور ہر شہر میں دیکھا جاتا ہے۔ شعر ہے:

ہر شخص کی باتوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے
اس شہر میں کوئی بھی قدآور نہیں رہتا

.....

وہ اپنے گرد و پیش کے لوگوں میں جہاں انتشار و افتراق پاتے ہیں وہیں یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ایک دوسرے کے ساتھ ان کا رویہ تبدیل نہیں ہوتا۔ شعر ہے:

دیوار و در و بام تو بدلے مگر اب تک
اس شہر کے لوگوں کا رویہ نہیں بدلا

.....

شہروں کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ وہاں بہت سے لوگوں کا خود کا مکان نہیں ہوتا انھیں عمر بھر کرائے کے مکان میں رہنا پڑتا ہے جہاں وہ آزادی سے نہیں رہ سکتے بلکہ ایک بوجھ سا ہمہ وقت ان کے ذہن پر سوار رہتا ہے۔ شعر ہے:

لیتے ہیں سانس بھی تو ذرا سوچ سوچ کر
ہم لوگ رہ رہے ہیں کسی کے مکان میں

.....

اگر غور سے دیکھا جائے تو یہاں گھر کا مفہوم نہایت وسیع معانی و مطالب میں نظر آتا ہے وہ محض دیوار و در سے یا اینٹ گارے سے ترتیب دی ہوئی ایک عمارت ہی نہیں بلکہ وہ کسی غیر ملک کی بھی علامت ہو سکتا ہے۔ اکثر و بیشتر لوگ روزی روٹی کمانے کے لیے ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر کرتے ہیں اور وہاں چند ایسے اصولوں کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں جو ان کے ملک میں نہیں ہوتے یعنی گھٹ گھٹ کر زندگی گزارتے ہیں۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ پردیس میں رہنے والا شخص اپنی حقیقت کو اپنے عزیز و اقارب سے چھپاتا ہے اور اپنی تکلیف اس لیے بیان نہیں کرتا کہ اس کے گھر والے بھی پریشان نہ ہو جائیں اور اپنی جھوٹی خوشی ان پر ظاہر کرتا ہے شعر ہے:

خالی لفافے بھیجتے رہتے ہیں ہم اسے
الماریوں میں بند ہیں، سب خط لکھے ہوئے

.....

غزل میں ہر دور میں عشق حاوی رہا ہے کسی بھی مزاج کی غزل حسن و عشق کی داستان اپنے اپنے طریقے سے بیان کرتی ہے۔ لیکن خاص بات یہ بھی ہے کہ بدلتے ہوئے زمانے نے حسن و عشق کے مزاج کو بھی یکسر بدل کر رکھ دیا ہے پہلے عاشق وفا پیکر اور وفا شعار ہوتا تھا اور محبوب کے ہر ظلم کو برداشت کرنا فرضِ عین سمجھتا تھا لیکن آج کا شاعر جس مزاج میں ڈھلا ہوا ہے وہ اسے تادیر محبوب کا وفادار رہنے نہیں دیتا۔ شعر ہے:

ناصر بشیر اس سے بچھڑنا ہی تھا ہمیں
خود کو بھلا خراب کیا جائے کس لیے

.....

یعنی آج کا عاشق محبوب سے بچھڑنے کا کوئی شدید غم نہیں کرتا بلکہ وہ فراق کے لیے تیار رہتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ اسے وصال کی آرزو نہیں رہتی وہ محبوب سے ملاقات کا خواہاں بھی رہتا ہے لیکن اس سلسلے سے بھی خود کو اعلیٰ محسوس کرتا ہے وہ وصال میں اپنا فائدہ نہیں بلکہ محبوب کا ہی فائدہ سمجھتا ہے۔ شعر ہے:

مہک اٹھے گا ترا قریۂ بدن سارا
تو اپنے پاس سے مجھ کو ذرا گزرنے دے

.....

یہ بھی آج کا المیہ ہے کہ وہ افراد جن کی فطرت میں لاابالی کیفیت ہو یا کسی ایک مقام پر ٹھہرنا نہ چاہتے ہوں وہ دھیرے دھیرے اپنے ساتھیوں سے دور ہونے میں ہی اپنی بھلائی سمجھتے ہیں۔ شعر ہے:

فی الحال ایک دوسرے کو کہہ رہے ہیں ٹھیک
اب دیکھنا ہے پہلے بدلتا ہے رائے کون

.....

یعنی پروفیسر ناصر بشیر آج کے عاشق و معشوق کی نفسیات سے بھی خوب واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اب وہ زمانہ نہیں جب لوگ عہد و پیمان کی وجہ سے تمام عمر ایک ساتھ کاٹ دیتے تھے۔

انسان کی نفسیات کا ذکر کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی ان گنت خواہشات ہوتی ہیں وہ جہاں جس بازار یا دکان سے گزرتا ہے تو اسے دیکھ کر سوچتا ہے کہ وہ جس شے پر نگاہ کر رہا ہے وہ اس کی ضرورت میں شامل ہے۔ شعر ہے:

دکاں میں رکھا ہوا مال دیکھ کر یہ لگا
کہ جیسے گھر میں تو ہر چیز کی ضرورت ہے

.....

پروفیسر ناصر بشیر کی شاعری پر اس سے کہیں زیادہ گفتگو کی جا سکتی ہے ان کے اشعار اور ان کے ماضی الضمیر کو سمجھنے کے لیے چند صفحات نہیں بلکہ ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے لیکن اس مختصر سے مضمون میں ان کی شاعرانہ پرواز کی سمت و رفتار کا بیان کرنا امکان میں نہیں۔ چند الفاظ میں کہا جائے تو اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ایک اچھا شاعر وہی ہوتا ہے جو اپنے اسلاف سے سیکھتا ہے اپنے ماضی کو یاد رکھتا ہے اپنی روایت کا پاسدار ہوتا ہے لیکن اس طرح کہ اس کی شاعری میں اس کا عہد سانس لیتا ہوا نظر آتا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کے شعر میں یہ وصف ہوتا ہے کہ وہ زمان و مکان کی قید یا حدود میں گرفتار نہیں ہوتا بلکہ اسے ہر دور کا قاری جب پڑھے تو اسے لگے کہ یہ اس کے زمانے اور اس کے گرد و پیش کی بات ہے۔ اسی طرح اچھی شاعری کسی خاص عمر کے قاری کے لیے ہی نہیں ہوتی بلکہ اس میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ اسے کسی بھی سن و سال کا ادب شناس شخص پڑھے تو وہ اس سے حظ اٹھائے بغیر نہ رہ سکے اس طرح اچھی شاعری کسی خاص جنس تک اپنے نقوش نہیں چھوڑتی بلکہ چاہے وہ مرد ہو یا صنفِ نسواں اس پر اچھی شاعری کا اثر ہوتا ہے۔ ان نکات کی روشنی میں دعوے کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ پروفیسر ناصر بشیر کا شمار بڑے شعرا میں ہوتا ہے۔ اس میں عوامی جھلک بھی ہے اور خصوصی انداز بھی، اس میں واردات قلب و نظر بھی اور جذبات کی بہترین عکاسی کے ساتھ ساتھ دنیا کے وہ مسائل بھی موجود ہیں جو واردات حسن و عشق تک محدود نہیں۔ میں اس مضمون کو ان کے ایک شعر پر اختتام تک پہنچاتا ہوں:

میں جو بھی لفظ لکھوں وہ ستارا بن جائے
مرے قلم میں یہ کس نے کمال رکھا ہے

ناصر بشیر

☆☆☆☆☆

رات کی راہداری میں ___ سجاد بلوچ

پہلے پہل سجاد بلوچ کا نام سنا تو قرطاسِ ذہن پر ہیر وارث شاہ کا خوبصورت کردار مراد بلوچ اُبھر آیا۔ دھیان میں آیا کہ یہ نوجوان کسی بلوچ قبیلے کا چشم و چراغ ہوگا۔ اور جملہ بلوچ جمالیات کا مظہر ہوگا۔

پھر جناب نوید صادق کے توسط سے سجاد بلوچ سے ملاقات کی سبیل نکل آئی اور وہ بھی یوں کہ ایک تسلسل کے ساتھ ---- اور اب اگر ہمسائے کی تعریف میں معمولی رد و بدل کی گنجائش نکل آئے (میرا خیال ہے، جناب نوید صادق جدید تناظر میں ایسی کوئی صورت نکال ہی لیں گے) تو وہ سب جو اس کے حوالے سے دھیان میں در آیا تھا، صد فیصد سے بھی کہیں زیادہ درست نکلا۔ لیکن اس کا اندر ابھی تک مجھ سے پوشیدہ تھا اور میرا یہ مسئلہ اس کی شاعری نے حل کر دیا۔

سجاد بلوچ کی منفرد اور جدید اُسلوب کی حامل غزلیات پڑھ سن کر دل سے آواز آئی: سجاد بلوچ اب کسی اور قبیلے کا سردار ہو نہ ہو، ادب قبیلے میں اپنی سرداری قائم کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ سجاد بلوچ کم گو شخص ہے میرے خیال میں وہ ان لوگوں کو کم گو لگا ہوگا جن سے اس کی محض دوستی ہے، یاری نہیں۔ واضح کرتا چلوں کہ میرے نزدیک

اکمل حنیف

دوستی اور یاری میں بہت فرق ہے قصہ مختصر وہ دوستوں سے ایک فاصلہ رکھتا ہے، یاروں کا یار ہے اور یاروں میں وہ بہت بولتا ہے اور خوب بولتا ہے مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ بلوچ وجاہت کا شہکار یہ جوان پچھلے کسی جنم میں یقیناً کسی بڑے اور تہذیب یافتہ قبیلے کا سردار رہا ہوگا۔

سجاد بلوچ بھرپور گفتگو کرنے والا زندہ دل انسان ہے اور محفل یاراں میں اس کے جملے انتہائی کاٹ دار ہوتے ہیں جس طرح سجاد بلوچ نجی محفلوں میں دوستوں کو حیران کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنے اشعار کے ذریعے اپنے قارئین وسامعین کو بھی حیرت میں ڈالنے اور چونکانے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سجاد بلوچ کو شعر کہنے کا ڈھنگ آتا ہے اور اس قدر آتا ہے اس سے رشک آنے لگتا ہے کچھ لوگ تو سجاد کے اشعار پر نہ چاہتے ہوئے بھی جانے انجانے میں رشک سے حسد کی حدود میں داخل ہو جاتے ہیں۔ سجاد بلوچ مملکت شعر میں اکثر گھس بیٹھیوں کے مانند شعر گھڑتا نہیں، خدا کی عطا سے روایت وجدت کے خوبصورت امتزاج سے ایسے اشعار تخلیق کرتا ہے کہ پڑھنے سننے والے سوچتے ہیں کہ اُردو غزل کا مستقبل محفوظ ہاتھوں میں ہے۔

سجاد بلوچ اپنے اسلوب کی انفرادیت کے سبب اپنے ہم عصر شعرا کرام میں اپنی الگ پہچان رکھتا ہے۔ سجاد بلوچ کی غزلوں کے منفرد اور اچھوتے مضامین قافیہ اور الفاظ کو نئے معانی دینے کے ساتھ ساتھ اپنے عام قاری سے لے کر سنجیدہ ادبی ذوق رکھنے والے قاری کو بھی اپنے حصار میں لے لیتا ہیں اس کی غزلوں کے مصرعے اتنے رواں دواں اور مترنم ہوتے ہیں کہ ہر پڑھنے اور سننے والا بے ساختہ گنگنانے لگتا ہے اس کی وجہ شاید سجاد کا ازحد سریلا ہونا ہو۔ ممکن ہے سجاد بلوچ اشعار کہتے ہوئے گنگنانے کی صلاحیت کو بھی بروئے کار لاتا ہو۔

سجاد کی شاعری میں موضوعات کا تنوع بھی قابلِ دید ہے_ فلسفہ، نفسیات، سیاست، معاشرتی اقدار کی بدحالی، رشتوں یا موسموں میں تبدیلی کی بات ہو، یا پھر غزل کا بنیادی موضوع عشقِ مجازی یا عشقِ حقیقی ہو، سجاد بلوچ نے ہر موضوع کو جدت کا رنگ عطا کرتے ہوئے شعری جمالیات کو اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

سجاد بلوچ مضامین کو اشعار میں اتنی خوبصورتی سے ڈھالتا ہے کہ پرانے موضوعات پر بھی نئے کا گماں گزرتا ہے۔ بظاہر سادگی سے متصف یہ اشعار تہہ دار ہیں۔

سجاد بلوچ کے بارے اس گفتگو کی وجہ اس کا دوسرا شعری مجموعہ ''رات کی راہداری میں'' ہے۔ مسلسل ایک ہفتہ ''رات کی راہ داری میں'' کا قاری رہنے کے بعد مجھ پر واجب ہو گیا تھا کہ اتنے خوبصورت اور تر و تازہ شاعر کی احباب سے ملاقات کرائی جائے۔

ویسے تو اس شعری مجموعہ کی ڈھیروں غزلیں سجاد بھائی کے روبرو بیٹھ کر سننے کا شرف بھی حاصل ہو چکا ہے۔ مگر کتاب میں پڑھتے ہوئے بھی ہر کلام پر پہلی بار پڑھنے کا احساس ہوتا رہا ہے اور بہت سے اشعار اپنی نئی پرتوں کے ساتھ مجھ پر وا ہوتے گئے اور میں سجاد بلوچ کو ''واہ سجاد بھائی'' ''کیا کہنے'' کہتے ہوئے داد دیتا رہا۔

''رات کی راہداری میں'' کو پڑھنے کے دوران میں نے جن اشعار کو بطور بہترین اشعار منتخب کیا، احباب کی نذر کر رہا ہوں۔ آپ بھی ان اشعار سے لطف لیجیے۔ یقیناً آپ قدم قدم میری تائید پر خود کو مجبور پائیں گے کہ سجاد بلوچ امروز و فردا کے ادبی فلک پر ایک روشن ستارہ ہے:

ذرا سے پھل کے لیے شاخ کاٹ لی تم نے
یہ بھوک کی تو علامت نہیں ہوس کی ہے

.....

اگر کسی نے خریدا نہ آج بھی مرا دن
تو معذرت مرے لیل و نہار تھک گیا میں

.....

تو جو کرتا ہے خریدی ہوئی چیزیں آزاد
یہ تو کفارہ نہیں پیڑ کی بربادی کا

.....

بھلا ہو آپ کا جو چاک دامانی سمجھتے ہیں
وگرنہ لوگ اس وحشت کو عریانی سمجھتے ہیں

.....

اس درجہ بڑھ گئی ہیں ہماری ضرورتیں
بازار آ لگا ہے ہمارے مکان سے

.....

میں نے کیا کرنا ہے اس قیمتی گلدستے کا
دوست ہے وہ تو مصیبت میں سرہانے بیٹھے

بیٹھے ہیں اگلی نشستوں پہ تمہیں دیکھنے کو
ورنہ ہم خالی کلاسوں میں بھی پیچھے بیٹھے

.....

میں آخر میں جناب سجاد بلوچ کو خوبصورت شعری مجموعہ کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے دعا گو ہوں کہ ''رات کی راہداری میں'' کو عام و خاص میں یکساں پزیرائی حاصل ہو۔

''رات کی راہداری میں'' اردو شعر کی دنیا میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

☆☆☆☆☆

''مذاق'' کا شاعر ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

مزاح کیا ہے؟ ایسی تحاریر جو آپ کو ہنسنے پر مجبور کر دیں اور اس تحریر میں تنقید کو مزاح کا جامہ پہنا دیا جائے، لیکن اس کے باوجود بھی قاری ہنسنے پر مجبور ہو جائے طنز و مزاح کہلاتا ہے۔ تلخ لہجوں، بدلتے رویوں کے برعکس جب معاشرہ مجموعی طور پر بگڑنے لگتا ہے اور ایسے میں مزاح نگار کا یہ احساس شدت اختیار کر جاتا ہے کہ معاشرے کی اصلاح ممکن نہیں تو اس وقت وہ انسانیت سے بیزار ہو جاتا ہے اور طنز پر اُتر آتا ہے اور یہی طنز جب شدت اختیار کر لیتا ہے تو اپنی قوت کھو دیتا ہے اور مذمت بن کر رہ جاتا ہے۔ مزاح نگار کے دل میں فرد اور معاشرے کے لیے رحم اور محبت کا جذبہ بیدار ہوتا ہے، جبکہ طنز نگار کے دل میں نفرت اور دشمنی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ کیونکہ مزاح نگار کا مقصد لوگوں کو ہنسانا اور خوش کرنا ہوتا ہے، جبکہ طنز نگار جس پر ہنستا ہے، اس سے نفرت بھی کرتا ہے، اُسے تبدیل کرنے کا خواہاں بھی ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سعید اقبال سعدی کا شمار بھی ایسے ہی باکمال مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ جن کی زندگی کا مقصد دوسروں کو ہنسانا اور خوش کرنا ہے۔ وہ شعبہ کے اعتبار سے Skin Specialist ڈاکٹر ہیں، وہ مریض کی Skin پر لگے داغ دھبے ہی نہیں دیکھتے بلکہ دُکھ اور درد کے ہاتھوں مات کھائے ہوئے دلوں کے زخم بھی دیکھنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر سعدی دکھنے میں ایک سنجیدہ، رعب دار اور خاموش طبع انسان نظر آتے ہیں، حقیقت میں ایسا بلکل نہیں، وہ ہر عام و خاص سے بات کرنے کا رویہ ایک جیسا ہی اپناتے ہیں۔ وہ مذاق کرنے اور مذاق اڑانے میں فرق کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر سعید اقبال سعدی کے مزاحیہ اور طنزیہ کلام پر مبنی شعری مجموعہ ''مذاق'' کے مطالعہ سے یہ بات بڑے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب جیسے ادب دوست کی موجودگی ہمارے لیے بہت ضروری ہے، ایسا دوست جو مثبت باتیں مذاق کی صورت میں کرتے ہوئے خود بھی ہنستا ہے اور دوسروں کو بھی

صدام ساگر

ہنساتا ہے۔ اس کتاب کے آغاز میں چند قطعات خواتین کے لیے شامل کیے گئے ہیں، جس میں سے ایک قطعہ دیکھیے جو مجھے بھی بہت پسند ہے۔

کہا بیوی نے موبائل بٹن والا دیا ہے کیوں
چلے انگلی سے میری اس میں یہ جوہر نہیں ہے
کہا شوہر نے چھوٹی سی مشینی چیز ہے یہ
چلے انگلی پہ تیری یہ تیرا شوہر نہیں ہے

.....

میاں بیوی کی نوک جھوک پر مبنی ایک قطعہ خواتین کے لیے شوہرانہ مذاق سے:

بیوی بولی جب کبھی بازار جاتی ہوں میں
مجھ کو اس کھوکھے کا مالک دیکھتا ہے گھور کر
بولا شوہر جانِ من وہ ہے کباڑی اصل میں
ڈالتا ہے وہ پرانی شے پہ ایسے ہی نظر

.....

مزاح میں نئی جہات کی تشکیل ناممکن ہے کیونکہ بڑے بڑے مزاح نگاروں نے یہ کام تو کر لیا ہے، ہمارے عہد کے سید محمد جعفری، دلاور فگار، سید ضمیر جعفری، انور مسعود، سرفراز شاہد اور انعام الحق جاوید جیسے صاحبِ طرز مزاح نگاروں کی طرح الفاظ سے حسبِ منشا کام لینے کی اچھی مثالیں مل جاتی ہیں۔ ڈاکٹر سعدی بھی الفاظ کے فن کارانہ استعمالات کا تخلیقی شعور رکھتے ہیں، اسی لیے ان کی شاعری میں الفاظ اور معانی کا تسلسل ایک ساتھ پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سعدی کے ہاں آج کے نمائشی اور فیشن ایبل مولوی کے حوالے سے ان کی منظر کشی دیکھیے:

میں نے پوچھا مولوی صاحب سے رائے دیں مجھے
گوشت دنبے کا ہے یا کہ ران بکرے کی لذیذ
مولوی صاحب یہ بولے رائے دوں گا میں تمھیں
بھون کر جب دونوں چیزیں لاؤ گے میرے عزیز

.....

ڈاکٹر سعدی کے "مذاق" میں کرونائی دور کی سنگین صورتحال میں بھی خوشی کی لہر نظر آتی ہے:

اب آ گئی ہیں عورتیں ساری نقاب میں
کووڈ نے اپنا خوف حسینوں میں بھر دیا
وہ کام جو بڑے بڑے عالم نہ کر سکے
وہ کام ایک چھوٹے سے وائرس نے کر دیا

.....

ڈاکٹر سعدی کے "مذاق" میں طنز کے اثرات بہت کم کم ملتے ہیں۔ ان کا ہلکا پھلکا مزاح ہر طبقے کو پسند آتا ہے اور آسانی سے سمجھ میں آ جاتا ہے، وہ مشکل ردیف، قافیوں کے چکر میں نہیں پڑتے بلکہ نہایت سادہ اور سلیس زبان میں اپنی بات کا اظہار کر دیتے ہیں۔

"ممتاز شاعر، افسانہ نویس، ڈرامہ نگار اعتبار ساجد بتاتے ہیں کہ" مجھے ڈاکٹر سعید اقبال سعدی کے ہاں طنوع کا احساس ملتا ہے اور انھیں پڑھ کر ہمیشہ راحت محسوس ہوتی ہے، ان کے شعری مجموعہ "مذاق" مجموعی طور پر مختلف موضوعات پر محیط ہے جو رنگ برنگے، کھٹے میٹھے ذائقے دار ہیں۔"

ڈاکٹر ہونے کے کارن وہ عام زندگی کی طرح اپنے مریضوں سے بھی ہلکا پھلکا مذاق کر لیتے ہیں۔ ان کے "مذاق" میں میڈیکل مذاق بھی شامل ہے۔ جس میں ایمرجنسی کال، ڈیانت کی دوا، خوبصورتی کا راز، محبوبہ کے نظر انداز کرنے پر ڈاکٹر کا پلان، فون پر مزاج پرسی، سرجری،

سرکاری ڈاکٹر، لیبارٹریز، لیب ٹیسٹ، پرائیویٹ ہسپتال، کالی بھیڑیں اور عطائی قصائی سمیت دیگر موضوعات پر قطعات پڑھنے کو ملتے ہیں۔ ان قطعات میں نظر سے اوجھل سچائیاں بھی بڑی صاف گوئی کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔ بحیثیت سکن سپیشلسٹ ڈاکٹر وہ لکھتے ہیں کہ:

جلد کے ماہر جلد سنوارا کرتے ہیں
مرد و زن کا حُسن اُبھارا کرتے ہیں
اپنی چمڑی بے شک حد سے کالی ہو
اوروں کی اسکن نکھارا کرتے ہیں

ڈاکٹر سعدی گذشتہ کئی سالوں سے ملک میں ہونے والی چور دروازے کی سیاست سے اس قدر مایوس دکھائی دیتے ہیں کہ جس کا اظہار وہ اپنے سیاسی مذاق میں کچھ اس طرح کرتے نظر آتے ہیں:

زرداروں مالداروں وڈیروں کی موج ہے
اپنے وطن میں فصلی بٹیروں کی موج ہے
ہو دور کوئی یہ تو حکومت کا جزو ہیں
جمہوریت میں اونچے وڈیروں کی موج ہے

....

اپنے سیاسی مذاق میں انہوں نے جمہوری دور، مقروض اور مفلس وطن کو کھوکھلا کرنے والے چہروں کو بے نقاب کرنے، آنکھوں دیکھے حالات و واقعات پر چپ سادھ رکھنے والے نابینا چہروں کو روشنی دینے اور آج کے سیاست دانوں کو پاکستان کا زخم خوردہ چہرہ دکھانے کا کام کیا ہے۔

یوں تو سب اللہ کا احسان کہتے ہیں مجھے
میرے سارے لوگ اپنی جان کہتے ہیں مجھے
زخم خوردہ خوں رسیدہ میرا چہرہ دیکھ کر
اب زمیں کے لوگ پاکستان کہتے ہیں مجھے

ڈاکٹر سعدی کے اس شعری مجموعہ "مذاق" میں ان قطعات کے علاوہ عیدالفطر، عیدالاضحیٰ، بجلی، متفرق قطعات، مزاحیہ نظمیں اور زعفرانی غزلیں شامل ہیں۔ اس کتاب کا انتساب انہوں نے اپنے اُستاد محترم ڈاکٹر انعام الحق جاوید کے نام کیا ہے۔ جو ان کی دلی عقیدت اور والہانہ محبت کا اظہار ہے۔ ڈاکٹر سعدی سنجیدہ شاعری کے بھی بہت عمدہ شاعر ہیں، لیکن اُن کی پہچان مزاحیہ شاعری ہی بنی، وہ ver style اداکار بھی رہ چکے ہیں، جی ہاں وہ پاکستان ٹیلی وژن کے کئی ڈراموں میں اپنی اداکاری کے جوہر بھی دکھا چکے ہیں، مگر اُن کی وجہ شہرت ادب کا میدان ہی ثابت ہُوا۔ وہ کئی عرصہ تک ادبی تنظیم سفینہ ادب کے زیر اہتمام محفل مشاعروں کا انعقاد بھی کرتے رہیں۔ افسوس بہت سے نقلی چہروں کی مفاد پرستی کے سبب یہ سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا۔ اختتام پر یہی کہوں گا کہ ڈاکٹر سعدی جیسے انمول لوگ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے، کیونکہ ایسے لوگوں کی باتیں اور الفاظ بھی انمول ہوتے ہیں۔ آخر میں ان کا مہنگائی اور بکرا عید کے حوالے سے ایک قطعہ ملاحظہ کیجیے:

مفلس و نادار قوموں کے نمائندوں میں ہے
تو ابھی تک تیسری دنیا کے باشندوں میں ہے
اتنی مہنگائی میں قربانی کی صورت ہے یہی
اپنا بکرا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے

☆☆☆☆☆

''کہتے ہیں کہ اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا''

وہ جب لکھنو سے چلے تھے تو گاڑی کا کرایہ بھی پاس نہ تھا۔ ناچار ایک شخص کے ساتھ شریک ہوگئے۔ دلی کو خدا حافظ کہا۔ تھوڑا آگے گئے تو اس شخص نے کوئی بات کی۔ یہ اس طرف سے منہ پھیر کر بیٹھے رہے۔ کچھ دیر کے بعد اس شخص نے پھر کوئی بات کی تو چیں بجبیں ہوکر بولے صاحب قبلہ آپ نے کرایہ دیا ہے۔ بے شک گاڑی میں بیٹھے۔ مگر باتوں سے کیا تعلق۔ اس نے کہا۔ حضرت! کیا مضائقہ ہے۔ راہ کا شغل ہے۔ باتوں سے ذرا جی بہل جائے گا۔ بگڑ کر بولے آپ کا شغل ہے۔ میری زبان خراب ہوتی ہے۔ لکھنؤ پہنچے تو مسافروں کے دستور کے مطابق ایک سرائے میں اترے۔ جب معلوم ہوا کہ یہاں مشاعرہ ہے۔ رہا نہ گیا۔ اسی وقت غزل لکھی اور مشاعرے میں شریک ہوگئے۔ ان کی وضع قدیمانہ تھی۔ کھڑکی دار پگڑی، پچاس گز کے گھیر کا جامہ، اک پورا تھان پستولیے کا کمر سے بندھا، ایک رومال پٹڑی دار تہہ کیا ہوا۔ اس میں آویزاں مشروع پاجامہ، جس کے عرض کے پائینچے، ناگ پھنی کی آنی دار جوتی، جس کی ڈیڑھ بالشت اونچی نوک، کمر میں ایک سیف یعنی سیدھی تلوار، دوسری طرف کٹار، ہاتھ میں جریب---وہ جب مشاعرے میں گئے تو وہ شہر لکھنؤ، نئے انداز، نئی تراشیں، بانکے ٹیڑھے جوان جمع، انہیں دیکھ کر سب ہنسنے لگے --- غریب الوطن، زمانے کے ہاتھ سے پہلے ہی دل شکستہ، ایک طرف ہوکر بیٹھ گئے۔ شمع ان کے سامنے آئی تو پھر سب کی نظر پڑی۔ بعض اشخاص نے ان سے پوچھا حضور! کا وطن کہاں ہے؟۔ انھوں نے فی البدیہہ یہ قطعہ کہہ کر غزل طرحی میں داخل کیا:

دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روز گار کے

جس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

.....

جب سب کو معلوم ہوا تو بہت معذرت ہونے لگی۔ ان سے عفو تقصیر چاہی۔ صبح ہوتے ہوتے شہر میں مشہور ہوگیا کہ میر صاحب تشریف لائے ہیں''۔

مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب ''آب حیات'' میں یہ واقعہ کائنات سخن میر تقی میر کے بارے میں لکھا ہے۔

رانا محمد شاہد

میر تقی میر کے بارے میں معلومات کا اہم ذریعہ ان کی سوانح عمری ''ذکر میر'' ہے۔ یہ کتاب ان کے بچپن سے لے کر لکھنو میں ان کے قیام کے آغاز کی مدت تک محیط ہے۔ دلی میں بھی ان کا وقت گزرا۔ وہ پرانی دلی میں جس جگہ رہتے تھے۔ اسے ''کوچہ چلم'' کہا جاتا تھا۔ ''ذکر میر'' کے مطالعہ سے ہی ہمیں ان کے خاندانی حالات کے بارے میں معلوم ہوتا ہے۔ میر کی اس سوانح عمری کے ذریعے ہم انہیں بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

میر تقی میر اعلیٰ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ مگر ان کا خاندان ہمیشہ نامساعد حالات سے دوچار رہا۔ میر کے آباؤ اجداد حجاز سے ہجرت کر کے ہندوستان آ بسے۔ کچھ عرصہ حیدر آباد اور احمد آباد میں گزار کر آگرہ کو مستقل ٹھکانہ بنالیا۔ میر 1732 میں اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ کا انتقال بہت کم سنی میں ہوگیا تھا۔ والدہ کے بعد والد نے انہیں اپنی نگرانی میں لے لیا۔ والد کا نام محمد علی تھا۔ لیکن وہ علی متقی کے نام سے مشہور تھے۔ میر کے والد ایک نیک اور پرہیز گار انسان تھے۔ ایک درویش تھے۔ ان کا نظریہ حیات تھا کہ یہ دنیا فانی ہے۔ انسانی جسم ناپائیدار ہے۔ موت اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ کوئی چیز بھی باقی رہنے والی نہیں ہے۔ دنیا کے ساتھ خود کو ملوث کرنا نادانی ہے کہ اسے ایک دن ختم ہونا ہے۔ انسان کو دوسروں کے کام آنا چاہیے اور سادہ طرز زندگی اپنانی چاہیے۔ والدہ کے بعد والد میر سے بہت محبت رکھتے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دیتے اور انہیں اکثر اچھی اچھی باتیں بتاتے رہتے تھے۔ چونکہ آپ کے والد کا زیادہ وقت یاد الٰہی میں گزرتا تھا۔ اس لیے انھوں نے میر کو اپنے شاگرد عزیز سید امان اللہ کے سپرد کر دیا۔ سید امان اللہ نے میر کا بہت خیال رکھا اور میر بھی ان سے محبت رکھتے تھے۔ ابھی 9 برس کے تھے کہ سید صاحب انتقال کر گئے۔ تب ان کے والد نے خود تعلیم و تربیت شروع کی۔ چند ماہ گزرے تھے کہ والد بھی وفات پا گئے۔ یوں نوعمری سے ہی میر تقی میر کی رنج و الم سے بھری زندگی کا آغاز ہوگیا۔ ان کے سوتیلے بھائی نے اچھا سلوک نہ کیا تو تلاش معاش کی فکر میں دلی آ گئے۔ یہاں ایک نواب کے ہاں ملازمت کر لی۔ جب نواب ایک جنگ میں مارے گئے تو واپس آگرہ لوٹ آئے۔ مگر یہاں گزر اوقات کی کوئی صورت نہ بنی تو دوبارہ دلی کا رُخ کیا۔ یہاں اپنے خالو سراج الدین آرزو کے ہاں قیام کیا۔ سوتیلے بھائی نے اکسایا تو خالو نے بھی پریشان کرنا شروع کر دیا۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ دلی کے قیام کے دوران ہی ان کی شاعری کو پختگی اور عروج حاصل ہوا۔ شعر گوئی میں وسعت حاصل ہوئی۔ ان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔

میر کا زمانہ بے بسی اور لاچارگی کا زمانہ تھا۔ ہر طرف شورشیں اور فتنہ و فساد برپا تھا۔ مغلیہ سلطنت زوال کے کنارے کو چھو رہی تھی۔ شرافت اور وضع داری قصہ پارینہ ہو چکی تھی۔ تنگدستی اور مشکل حالات کے بعد بالآخر میر گوشہ عافیت کے لیے 1782 میں لکھنؤ روانہ ہوئے۔ یہاں خوش قسمتی میر کا انتظار کر رہی تھی۔

چنانچہ واپسی پر ان کی شاعری کی دھوم مچ گئی، بڑی قدر و منزلت ہوئی۔ نواب آصف الدولہ نے وظیفہ 3 سو روپے ماہوار مقرر کر دیا۔ یوں زندگی آرام سے بسر ہونے لگی۔ مگر ایک دن کوئی بات طبیعت پر گراں گزری تو ناراض ہو کر دربار سے الگ ہو گئے۔ زندگی کے آخری سالوں میں جوان بیٹی اور پھر بیوی کے انتقال نے صدمات میں اضافہ کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ میر تقی میر نے اپنے گھر کا سودا کر کے بیٹی کو شادی کے وقت جہیز میں سب کچھ دیا۔ شادی کی رات کسی نے بیٹی سے کہہ دیا کہ ''تمہارے باپ نے تمہارا گھر بسا دیا، اپنا گھر اجاڑ کر''۔ بیٹی یہ صدمہ برداشت نہ کر سکی اور شادی کی رات ہی انتقال کر گئی۔ میر بیٹی کو دیکھنے گئے۔ کفن کی چادر ہٹائی اور اپنی زندگی کا آخری شعر کہا۔

اب آیا ہے خیال اے جان جاں اس نامرادی میں
کفن دینا تجھے بھولے تھے اسباب شادی میں

.....

مجنوں گورکھپوری اس حوالے سے لکھتے ہیں۔

''ہم کو یہ تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ میر غم کا شاعر ہے۔ میر کا زمانہ غم کا زمانہ تھا اور اگر وہ غم کے شاعر نہ ہوتے تو اپنے زمانے کے ساتھ دغا کرتے۔ میر نے غم کو نہ صرف تسلیم کیا بلکہ غم کو زندگی کی ایک نئی قوت میں تبدیل کر دیا''۔

یہ سچ ہے کہ میر تقی میر کی زندگی تلخیوں، تکلیفوں اور مصیبتوں میں گزری اور ان کی شاعری کا زیادہ تر حصہ اسی تکلیف کا احاطہ کرتا ہے بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہے کہ شعر بھی اشک بہاتے دکھائی دیتے ہیں۔

(1)

دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے
یوں اٹھے آہ اس گلی سے ہم
جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے
نالۂ سر کھینچتا ہے جب میرا
شعلہ اک آسماں سے اٹھتا ہے

(2)

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا
لہو آتا ہے جب نہیں آتا
صبر تھا ایک مونس ہجراں
سو وہ مدت سے اب نہیں آتا

.....

نثر میں میر کی تین فارسی کتب ہیں۔

1- ''لغات الشعرا'' میں اردو شعرا کا فارسی میں آپ بیتی ہے۔ اسے اردو ادب میں پہلا تذکرہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

2- ''ذکر میر'' میر تقی میر کی آپ بیتی ہے۔ جو ان کی زندگی کے بہت سے اوراق سے پردہ اٹھاتی ہے۔ اس کتاب میں ان کی نجی زندگی کے ساتھ ساتھ تاریخی کوائف بھی موجود ہیں۔ یوں اس کتاب کی ادبی اور تاریخی اہمیت ہے۔

3- ''فیض میر'' میر نے اپنے بیٹے کے لیے لکھی ہے۔ میر تقی میر اردو شعر و ادب کے وہ چراغ ہیں۔ جن روشنی اور چمک نے ہر دور کے اندھیروں کو روشن کیا۔ آپ نے اردو شاعری کے وہ دریچے کھولے کہ جن کی مدد سے معاصرین ادب نے اپنا انداز سخن نکھارا اور سنوارا۔ آپ کو کائنات سخن،

خدائے سخن اور سرآمد شعرا جیسے القابات سے نوازا گیا۔ وہ غالب ہوں مصفی، یا حسرت، یگانہ چنگیزی، ناصر کاظمی سب نے اپنے اپنے انداز میں آپ کو خراج تحسین پیش کیا۔

اے مصحفی تو اور کہاں شعر کا دعویٰ
پھبتا ہے یہ انداز سخن میر کے منہ پر
(غلام ہمدانی مصحفی)

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں کہ اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا
(مرزا غالب)

شعر میرے بھی پردرد ہیں لیکن حسرت
میر کا سا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں
(حسرت موہانی)

میر کے آگے زور چل نہ سکا
تھے بڑے مرزا یگانہ دبنگ
(یاس یگانہ چنگیزی)

شعر ہوتے ہیں میر کے ناصر
لفظ کچھ دائیں بائیں کرتا ہوں
(ناصر کاظمی)

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا
(شیخ ابراہیم ذوق)

جان کر میر کا کلام اثر
لوگ تیرا کلام لیتے ہیں
(امداد امام اثر)

اک بات کہیں گے انشاء جی تمہیں ریختی عمر ہوئی
تم لاکھ جہاں کا علم پڑھے کوئی میر سا شعر کہا تم نے
(ابن انشاء)

یہاں تک کہ ان کے ہم عصر شاعر مرزا محمد رفیع سودا نے انہیں یوں احترام دیا اور ان کے فن کا اعتراف کیا کہ۔

سودا تو اس زمین میں غزل در غزل ہی لکھ
ہونا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرح

.....

میر کی شاعری کے اسلوب کو دیکھتے ہوئے لگتا ہے۔ جیسے وہ باتوں باتوں میں شعر کہتا جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں تصویر کشی، منظر نگاری اور جزویات نگاری کا عمل دخل خاص طور پر موجود ہے۔ غم کی داستان ہو یا محبوب کی ستائش و آفرین کا اظہار کریں۔ اپنی تخلیقی و جمالیاتی شعور سے اس میں اثر آفرینی پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کی شاعری پڑھنے والے کو ایک سحر میں جکڑ لیتی ہے۔ میر کی غزلوں کے چھ دیوان ہیں۔ جس میں غزلوں کے علاوہ قصائد، مثنویاں، رباعیات اور واسوخت وغیرہ شامل ہیں۔ میر اردو شاعری میں واسوخت، مثلث اور مربع کے موجد ہیں:

سخت کافر تھا جس نے پہلے میر
مذہب عشق اختیار کیا

.....

عشق اک میر بھاری پتھر ہے
کب یہ تجھ ناتواں سے اٹھتا ہے

.....

میر صاحب زمانہ نازک ہے
دونوں ہاتھوں سے تھامئے دستار

.....

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں میرا دیوان رہے گا

.....

وہ تجھ کو بھولے ہیں تو تجھ پہ بھی لازم ہے میر
خاک ڈال، آگ لگا، نام نہ لے، یاد نہ کر

در و دیوار سن کے روتے ہیں
آہ تم تک مگر نہیں جاتی

اب تو جاتے ہیں بت کدے سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے گویا چراغ مفلس کا

الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

چاک کرنا ہے اسی غم سے گریبان کفن
کون کھولے گا ترے بند قبا میرے بعد

بعد مرنے کے مری قبر پہ وہ آئے میر
یاد آئی میرے عیسیٰ کو دوا میرے بعد

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو ، مرتبہ لوٹا گیا

عشق ہمارے خیال پڑا ہے، خواب گیا، آرام گیا
جی کا جانا ٹھہر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا

ہم ہوئے ، تم ہوئے کہ میر ہوئے
اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں
حالت اب اضطراب کی سی ہے

میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

دل جو زیر غبار اکثر تھا
کچھ مزاج ان دنوں مکدر تھا

آخر کار جب جہاں سے گیا
ہاتھ خالی کفن سے باہر تھا

خوش رہا جب تلک رہا جیتا
میر معلوم ہے قلندر تھا

میر تقی میر کو لفظ و معنی کا جادوگر کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ میر کی شاعری اور عظمت کا اعتراف ان لوگوں نے بھی کیا۔ جن کی شاعری ان سے بہت مختلف تھی۔ اردو ادب میں میر ایک عہد نہیں بلکہ ہر زمانے کا سخن ور ہے۔ ان کی شاعرانہ عظمت کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ زمانے کے ساتھ ساتھ شاعری کے مزاج میں ہونے والی تبدیلیوں کے باوجود ان کی شعری عظمت کا سکہ ہر عہد میں، ہمارا، غالب سے لے کر جون ایلیا تک ہر دور کے بڑے شاعر میر کی عظمت کے گن گاتے رہے۔ ہر دور کے بڑے شاعر میر تقی میر کی اس شاعری کے ناقابل تقلید اسلوب اور ان جذبات و احساسات کو اپنی کیفیات کے سانچے میں ڈھال کر ان سے مستفید ہوتے رہے۔ میر کو گزرے صدیاں گزر گئیں۔ مگر ان کا کلام آج بھی اپنی الگ اور منفرد پہچان رکھتا ہے۔ کائنات سخن میر تقی میر نے اپنے بارے میں کہا تھا:

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

☆☆☆☆☆

ستارے ہم سفر میرے

جناب امتیاز گلیانوی مستند اور اہم ترین افسانہ نگار اور سفر نامہ نگار ہیں اور گزشتہ دو دہائیوں سے پوٹھوہاری اور پنجابی نظمیں بھی کہہ رہے ہیں۔ زیرِ نظر مجموعہ ان کا پہلا اردو شعری مجموعہ ہے اور اس کے نام سے ہی پتہ چلتا ہے کہ شاعر کتنا حساس اور جدید طرزِ احساس کا نمائندہ ہے۔ ستارے جس کے ہم سفر ہوں وہ کہیں بھی رہے، ستارے اُس کے ساتھ رہتے ہیں اور جس کے ساتھ ستارے ہوں، اُس کی شاعری میں جدیدیت اور کلاسیک شاعری کے نمونے اور خیالات جا بجا ملیں گے۔ ایک شعر ملاحظہ فرمائیے:

ستارے ہم سفر میرے اُجالے ہم سفر میرے
مری مٹی کے رہتے ہیں حوالے ہم سفر میرے

.....

جس شاعر کو اپنی مٹی کی خوشبو کبھی نہیں بھولتی، اُس کی شاعری ہمیشہ پھلتی پھولتی ہے۔ جناب امتیاز گلیانوی علمی اور ادبی حوالے سے ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے زندگی کی پیچیدگیوں اور معاشی ناہمواریوں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اپنی زندگی کے تلخ و ترش اور حسین لمحوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے:

یوں لگتا تھا ساری دنیا اُس میں ہے
جوگی کے جو پاس پٹاری ہوتی تھی

چڑیوں اور پیڑوں کی باتیں سُنتا تھا
کہنے کو تو وقت گزاری ہوتی تھی

.....

جناب امتیازی گلیانوی کے احساسات اور جذبات ایک طوفانی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ اپنے نظریے اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ان کا شاعرانہ ذوق زندگی کی پریشانیوں کے ساتھ مل کر کڑوا ضرور لگتا ہے

نعمان منظور

لیکن قاری کو دعوت فکر بھی دیتا ہے:

جگر کا خوں بھی تو لازم ہے گل کھلانے کو
سنو کہ صرف گلستاں سے کچھ نہیں ہوگا

اُسے بتاؤ عقیدے کی منزلت کیا ہے
جو کہہ رہا ہے کہ ایماں سے کچھ نہیں ہوگا

.....

ان کی شاعری کی علمیت، اس کی زندگی کا رویہ، زندگی کو ایک مخصوص رنگ میں دیکھنے کی آرزو بنیادی آرزو رکھتا ہے۔ یہ انتہائی سنجیدگی سے معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں پر نظر رکھتے ہیں۔ ان کا لہجہ، ان کا اثر انداز ہونے کا طریقہ، ان کی شاعری کی غنائیت، سوچ اور ان کی دردمندی ان کی شاعری کی عظمت ہے۔ غزل اردو ادب کا بے حد قیمتی سرمایہ ہے۔ زندگی کے نت نئے تجربات اور مشاہدے ہی نہیں زندگی کی تمام تر نزاکتیں اور رعنائیاں ان میں موجود ہیں۔ محبت، شفقت، چاہتیں، عنایتیں، محرومیاں اور اُس کے تجزیے بھی غزل کی تفاصیل میں شامل ہیں۔ انسانی جذبے اور جدوجہد اُس کی کامیابی اور ناکامی، حوصلہ و ولولے، زندگی سے عبارت ہیں۔ ان ساری باتوں کا برملا اظہار، مختصر انداز میں ایک شعر میں سمویا جاسکتا ہے۔ دراصل زندگی کی روداد اس کے امکانات، اپنے مخصوص نظریوں کے ساتھ جب ہم بیان کرتے ہیں تو یہ ساری کاوشیں ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ یہ برملا اظہار کی صورت ہوتی ہے۔ یہ انسان کے اپنے نظریے اور رویے ہوتے ہیں جو ایک بھرپور زندگی کی نمائندگی کرتے ہیں۔

جو مجھ کو لگ رہا تھا محبت کا آدمی
جانچا تو صرف نکلا ہے نفرت کا آدمی
پاس آیا تو کھلا کہ نظر کا فریب تھا
لگتا تھا دور سے جو عقیدت کا آدمی
مجھ کو ملی ہے گھر سے یہی چیز قیمتی
میں امتیاز تھا ہی شرافت کا آدمی

.....

ٹی ایس ایلیٹ نے کہیں لکھا ہے: ”جب ایک تخلیقی ذہن دوسرے سے زیادہ بہتر ہوتا ہے تو اُس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جو بہتر ہوتا ہے وہ تنقیدی صلاحیت زیادہ رکھتا ہے۔“ جناب امتیاز گلیانوی کی شاعری میں یہی تنقیدی شعور نمایاں ہے۔ اسے حقیقت نگاری کی بھی اعلیٰ مثال کہہ سکتے ہیں۔ بعض اوقات سچائی کے ساتھ بے رحمی کا سا انداز نظر آتا ہے۔ بے لاگ تبصرہ ان کی شاعری کے حسن میں اضافہ کرتا ہے اور اسے ہم اِن کی گہری بصیرت بھی کہہ سکتے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں وجدان سے زیادہ شعور کی پیروی کی ہے۔ سادگی اور برجستگی ان کی شاعری کا نمایاں پہلو ہے۔ آسانی سے گوہر معانی ہاتھ آجاتا ہے۔ ان کی منزل روایت کی سرزمین سے پھوٹتی ہے لیکن جدید عصری رجحانات بھی اپنی پوری معنویت کے ساتھ ان کی شاعری کے حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔ جو انھیں دوسرے شاعروں سے

منفرد بناتے ہیں۔ یہ مصرع سازی کی فنی حیثیت سے واقف ہیں۔ مصرع کی تراش خراش میں ایک ماہر مجموعہ ساز کی سی مہارت درکار ہوتی ہے، جو ان کی غزلوں کی بحروں میں روانی کے ساتھ موجود ہے۔

غزل ایک مضبوط روایت کی حامل صنفِ سخن ہے۔ اس روایت کی پاسداری کرتے ہوئے نئے تخلیقی تجربات کی خاصی گنجائش ہوتی ہے۔ جناب امتیاز گلیانوی کے کامل تجربات، فن پر ان کی مکمل دسترس کا ثبوت ہے۔ یہ درست ہے کہ شاعری خونِ جگر کی نمود ہے۔ سیکڑوں نالہ ہائے شب، سیکڑوں آہوں کے بعد ہی ایک شعر وجود میں آتا ہے:

زندگی کی چلچلاتی دھوپ میں
اپنے ہی شانوں پہ سر رکھنا پڑا
جو نہیں تھے ایسے منصب کے لیے
اُن کو بھی تو معتبر رکھنا پڑا

.....

جسے بھی دیکھیے سہما ہوا ہے
یہ منظر تو بہت دیکھا ہوا ہے
کٹے گی رات کیسے جانتا ہوں
یہ دل تو شام سے ڈوبا ہوا ہے

ہم آنکھوں میں لہو بوتے ہیں صاحب
یہی ہے بس شجرکاری ہماری

.....

شاعری ایک فطری جذبہ ہے۔ طبیعت اگر موزوں ہو تو آمد کا سلسلہ وجود میں آتا ہے۔ شعر ذہن پر اس طرح نازل ہوتے ہیں جیسے بارش ہو رہی ہو، رم جھم کا موسم ہو اور شعر کے معنی، مفہوم، فنی باریکیاں، تاثر یہ سب بعد کی چیزیں ہیں۔ شعر تو وہ جو سنتے ہی دل کی گہرائیوں میں اُتر جائے۔ سننے والا جب اس سمندر کی گہرائی میں ڈوبنے کے بعد ابھرتا ہے تو پھر اُس کی معنویت، گہرائی اور دوسری چیزوں کے بارے میں سوچتا ہے۔ یہاں شعر کی معنویت ایک سماں پیدا کر دیتی ہے اور یہیں سے انسان کی شعوری کیفیت کا عمل شروع ہوتا ہے۔ جناب امتیازی گلیانوی کی شاعری میں ایسے مقامات بارہا آئے ہیں۔

انھوں نے غزل میں بے شک نئے تجربے نہیں کیے لیکن ''ستارے ہم سفر میرے'' میں رنگ برنگے گل بوٹے اگائے ہیں اور دلفریب نقش و نگار بنائے ہیں، جو دل کی گہرائیوں میں اُتر جاتے ہیں۔ ہم نے ان کی شاعری میں عاشقی کا انوکھا مزاج دیکھا ہے، جو روایتی ہرگز نہیں ہے۔ ان کی عاشقی مخصوص آن اور شان رکھتی ہے۔ یہ اپنے محبوب کو آزماتے بھی ہیں لیکن تہذیب کے دائرے میں رہ کر بات کرتے ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ ان کے عشق اور والہانہ انداز کی قدر کی جائے تاکہ معاشرے کی روایت کا پاس رکھا جائے۔ یہی بات ان کی شاعری کی مقبولیت کی دلیل ہے۔

ہم جناب امتیاز گلیانوی کو اس بات کی بھرپور مبارک باد دیتے ہیں اور ان کے شعری سفر کو اور سے زیادہ آگے بڑھتے ہوا دیکھ رہے ہیں۔

☆☆☆☆☆

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے ٹلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اورنٹل کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا "افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلی کیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب 'شاہ داستان' تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اُس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانحِ عمری Min iature لگتی ہے۔

شوکت علی شاہ

رانا سلیم اختر، کمشنر ملتان: طارق فاروق کی جگہ رانا سلیم اختر تعینات ہوئے۔ رانا صاحب پی سی ایس تھے ان سے بھی پہلے کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ میں اپنے افسروں کو لے کر اُنہیں ایئرپورٹ ملنے گیا۔ جہاز سے اُتر کر لاؤنج میں آئے تو کچھ سٹھیائے ہوئے سے لگتے تھے۔ گہرا سانولا رنگ جسے ناراضی کی صورت میں کالا بھی کہا جا سکتا تھا۔ قدرے گھونگھریالے بال، جس سے ان کی افریقن بیک گراؤنڈ کا سا گمان ہوتا تھا۔ درمیانہ قد، کسرتی بدن، سرخ نشیلی آنکھیں اور بس! ۶۰ء کے بیچ سے تعلق تھا اور ریٹائرمنٹ کے قریب تھے۔ ہمارے ارباب اختیار کی خوبی یہ ہے کہ گھر جانے سے پہلے

صوبائی افسروں کو ڈپٹی کمشنری یا کمشنری کا 'ہوٹا' ضرور ولواتے ہیں، چاہے وہ چند ماہ کے لئے ہی کیوں نہ ہو۔ آخر چالیس سال کی سروس کا کچھ تو صلہ ملنا چاہئے۔ رانا صاحب مجھے ملے لیکن باقی مجسٹریٹوں سے ہاتھ ملانے کی تکلیف گوارہ نہ کی۔ پولیس والے بھی کھڑے تھے۔ ذرا اونچی آواز میں کہنے لگے ''میں دوسرے کمرے میں نماز پڑھنے جا رہا ہوں۔'' مجھے بڑی حیرت ہوئی، ہم سی ایس پی افسروں کو مطعون کرتے ہیں یہ تو ان کا بھی گرو نکلا۔ میں نے ان کی کمرے سے آمد کا انتظار نہ کیا اور افسروں کو لے کر واپس چلا گیا۔

شام کو ان کے سٹاف افسر کا فون آ گیا۔ کمشنر صاحب نے گھر یاد فرمایا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ میں مصروف ہوں اس لئے نہیں آ سکتا اگر کوئی سرکاری کام ہے تو بتا دو وگرنہ کل دفتر میں ملاقات ہو جائے گی۔

تھوڑی دیر بعد وہ خود تشریف لے آئے۔ کہنے لگے ''آپ ناراض لگتے ہیں؟''

میں نے کہا ''یہ کون سا طریقہ یا طرزِ عمل ہے۔ میرے مجسٹریٹ آپ کو ملنے ایئرپورٹ گئے آپ نے ان سے ملنا تک گوارا نہ کیا۔ اگر صحافیوں پر اپنے پابند صوم و صلوٰۃ ہونے کا رعب ڈالنا تھا تو یہ کام دس منٹ بعد بھی کیا جا سکتا تھا۔''

کہنے لگے ''حقیقت یہ ہے کہ بلڈ پریشر کی وجہ سے میرے سر میں شدید درد تھا کیونکہ روانگی کے وقت میں ایک بری خبر ساتھ لے کر آیا ہوں جس سے طبیعت میں تکدر اور مزاج میں مخمص آ گیا تھا۔ مجھے اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہونا دشوار لگ رہا تھا اس لئے کچھ دیر ستانے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اب پوچھو گے نہیں کہ وہ بری خبر کیا تھی؟''

وہ مسکرائے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ پہلی ملاقات میں ہی بری خبر۔ میں نے ہونقوں کی طرح ان کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

کہنے لگے ''یہ سی ایس پی حضرات بڑے چالاک ہیں۔ کوٹہ کی وجہ سے مجھے ملتان تو بھیج دیا ہے لیکن ساتھ ہی میری واپسی کا بھی سکہ بند انتظام کر رکھا ہے۔ مجھے خبر ملی ہے کہ اگلی میٹنگ میں مجھے گریڈ اکیس میں پروموٹ کرنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے میں اس صورت میں کمشنر نہیں رہ سکتا۔ ان حالات میں صرف تم میری مدد کر سکتے ہو۔''

مجھے احمد سلیم اکبر یاد آ گیا۔ بالکل یہی الفاظ اس نے بھی کہے تھے۔ اگر فرق تھا تو صرف اتنا کہ وہ ترقی پا کر اسے لوٹانا چاہتا تھا اور یہ اس کے راستے میں کوئی دیوار کھڑی کرنے کا سوچ رہے تھے۔

''تو میں کیا کر سکتا ہوں؟''

بولے ''مجھے علم ہے کہ تمہارے وزیر اعلیٰ کے ساتھ بہت اچھے تعلقات ہیں۔ جب ترقی کے لئے سمری اس کے پاس جائے تو وہ اسے اٹکائے رکھے اور منظور نہ کرے لیکن اس سے بھی زیادہ آسان کام ہو سکتا ہے۔'' انہوں نے معنی خیز انداز میں میرا ہاتھ دبایا ''میری

خفیہ رپورٹوں میں سے چند ایک کو کہیں ادھر ادھر کھسکوا دو۔ نہ ہوگا بانس نہ بجے گی بانسری۔ بغیر مکمل ریکارڈ کے ترقی تو نہیں ہو سکتی ناں؟" عرض کیا" آپ نے میری صلاحیتوں کا شاید صحیح اندازہ نہیں لگایا لیکن ایک بات میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔ افسر نے پنشن کے بعد جس جگہ مستقل قیام کرنا ہو وہاں آخری دنوں میں نوکری نہیں کرنی چاہیے بعد میں بڑی تکلیف ہوتی ہے اور کئی سماجی مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں اور نفسیاتی اُلجھنیں پیدا ہو سکتی ہیں۔" کہنے لگے" وہ محاورہ تو تم نے سن ہی رکھا ہوگا

One Croweded hour of glorious life is worth an age without a name." جس طرح شاعر لوگ شراب کی چاہت میں عذاب کی پروا نہیں کرتے اسی طرح پی سی ایس افسر کے لیے کمشنری ہی سب کچھ ہے۔ مجھے دو سال کمشنر رہنے دیں پھر چاہے ملتان بدر کر دیں۔ میں سادھوؤں کی طرح جنگل میں کٹیا بنا کر رہ لوں گا۔" مجھے یقین ہو گیا کہ یہ پرعزم انسان اتنی آسانی سے جانے والا نہیں ہے۔

رانا صاحب کے ساتھ وقت بہت اچھا کٹا۔ ایک تو وہ اپنے کام سے کام رکھتے تھے، لاولد تھے، ان کی بیگم لیکچرار تھیں، نہایت ملنسار خاتون تھیں۔ انھیں اس بات کی پروا نہیں تھی کہ وزیر اعلیٰ کمشنر کے بجائے ڈی سی سے مشورہ کرتا ہے۔ حفظ مراتب کے معاملے میں بھی متشدد نہ تھے۔ وہ اس بات کو بھی اپنے لئے مفید سمجھتے تھے۔ وقتاً فوقتاً یاد کراتے رہتے۔ دیکھنا سرجی وزیر اعلیٰ کے دفتر سے نکلنے نہ پائے۔ میرے اے سی بخاری نے ان کے ساتھ پہلے بھی کہیں کام کیا تھا۔ اس نے ایک آسان گر بتا دیا۔ مہینے میں کم از کم ایک دفعہ انھیں صرف اتنا کہہ دیں کہ جناب! سیکرٹریٹ میں کچھ کھچڑی سی پک رہی ہے۔ کچھ سازشی عناصر آپ کی دستار کے درپے ہیں لیکن فکر نہ کریں۔ میں ہوں ناں! یہ سنتے ہی رانا صاحب کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے پیشانی پسینے سے تر ہو جاتی، گہرا سانولا رنگ مزید گہرا ہو جاتا، دل میں دھک دھک صاف سنائی دیتی۔ کہتے" فوراً ٹکٹ کٹا کر لاہور پہنچو اور اس کا توڑ کرو۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا کہ ہمیں کبھی چھٹی لینے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ مفت میں لاہور کی سیر ہو جاتی۔ ایک ٹکٹ میں دو مزے تو اکثر لوگ لیتے آئے ہیں ایک ٹکٹ میں سو مزے کوئی کوئی کرتا ہے۔ ذمہ داری لینے سے کوسوں دور بھاگتے تھے اور اس سلسلے میں کوئی رورعایت نہ کرتے۔ صاف کہہ دیتے۔ بھائی If it comes to your neck or mine. Restassured it will not be mine. انگریزی بہت اچھی بولتے، ڈرافٹنگ بھی متاثر کن تھی، زبان کی نوک

پلک سنوارنے کے ماہر تھے۔ نپے تلے اور متوازن فیصلے لکھتے۔ طبیعت میں آوارگی تو نہ تھی لیکن زندگی میں کچھ رنگ ضرور بھر رکھے تھے۔ ان کا دفتر نوجوان خواتین سے بھرا رہتا۔ ہر کسی کا تعارف بھانجی بھتیجی کہہ کر کرواتے۔ ایک دن بخاری کہنے لگا ''سر! اگر گوجرانوالہ سے لے کر ملتان تک ان کے خود ساختہ رشتہ داروں کی تعداد کو اکٹھا کیا جائے تو بوسن روڈ پر ایک پورا گرلز کالج کھل سکتا ہے۔'' اس کے علاوہ ایک شوق اور پال رکھا تھا۔ قلمی دوستی کی طرح یہ ہوائی دوستی کے شوقین تھے۔ ان کے گھر کے اوپر بہت بڑے پنجرہ نما اینٹینے لگے ہوئے تھے۔ فارغ وقت میں وائرلیس کے ذریعے مختلف ملکوں کے لوگوں سے گپ شپ لگاتے اور غائبانہ دوست بناتے۔

کرکٹ کے بھی رسیا تھے۔ کہتے کالج میں اپنی ٹیم کا کپتان تھا۔ اگر کھیلتا رہتا تو ایک دن قومی ٹیم میں جگہ بنا لیتا۔ وہ تو برا ہو شیکسپیئر کا جس نے کتابیں پڑھنے کا ایسا چسکا ڈال دیا کہ باؤلنگ کرتے ہوئے بھی نظروں کے سامنے مارک انٹونی کا ہیولا اُبھرتا جس نے گگلی پھینک کر سیزر کے قاتلوں کا بھرکس نکال دیا تھا۔ کھیل اور پڑھائی ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔ ذرا اپنی قومی ٹیم پر نظر تو ڈالو۔ یہ سب وہ لوگ ہیں جن کا بچپن سکول میں نہیں بلکہ محلے کے گلی کوچوں اور میونسپلٹی کے پارکوں میں گزرا ہے۔ دن میں اٹھارہ گھنٹے کرکٹ کھیلنا۔ پہلے ٹینس کی گیند کے ساتھ، پھر اس پر ٹیپ چڑھا کر اور آخر میں چندہ شدہ کرکٹ بال خرید کر۔ گیند کی شامت آ جاتی ہے۔ بال کی کھال اُتارنے والا محاورہ تو سن رکھا ہوگا اس بیچارے کی زوال کے بعد بھی جان نہ چھوٹتی۔ بخیے اُدھڑ جاتے ہیں، رنگ روپ بکھر جاتا ہے۔ یوں لگتا جیسے وہ کرکٹ کا گیند نہیں بلکہ دیہاتی لڑکوں کی چوگان کھیلنے والی ''کھنڈوری'' ہے۔ تب جا کر اس کی خلاصی ہوتی ہے۔ چودہ کروڑ کی آبادی، سولہ گھنٹے کرکٹ کھیلنے والوں میں سے گیارہ کھلاڑی تلاش کرنا چنداں مشکل نہیں ہوتا۔ کھلاڑی تو اچھے مل جاتے البتہ چند قباحتیں ضرور پیدا ہو جاتیں۔ وہ ہیں۔ Chucking and cheating ہمارے اکثر باؤلر گیند تو تیز پھینکتے ہیں لیکن انداز بسا اوقات ''وٹہ'' پھینکنے والا ہوتا ہے۔ جسے انگریز نے اپنی سہولت اور ہماری جگ ہنسائی کے لئے Illegal delivery کا نام دے رکھا ہے۔ جگ ہنسائی کے علاوہ رسوائی کا اہتمام ہم نے خود کر رکھا ہے۔ کبھی خبر آتی ہے کہ ہمارے کھلاڑی بال کے بخیے اُدھیڑتے ہوئے پکڑے گئے ہیں تو کبھی پتہ چلتا ہے کہ چرس پیتے ہوئے جزائر غرب الہند میں اندر ہو گئے ہیں۔ میچ فکسنگ کے بھی ماہر

ہیں۔ امام مسجد یا کسی نائب قاصد کا بیٹا ہونا کوئی عیب نہیں ہے۔ ہم سب مسلمان اور پاکستانی ہیں۔ ملک کو بیچ کھانا اور قوم کے جذبات سے کھیلنا البتہ بری بات ہے۔ لوگ ان کی جیت پر شرطیں بدتے ہیں اور یہ گھات لگائے بکیوں کی کمین گاہوں میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ کھلاڑیوں کی اکثریت انگریزی نہیں جانتی۔ گو انگریزی نہ جاننا کوئی عیب نہیں ہے لیکن بدقسمتی سے کرکٹ اور انگریزی لازم وملزوم ہو گئے ہیں۔ میچ جیتنے یا ہارنے کی صورت میں کپتان اور مین آف دی میچ سے جب انگریزی میں سوالات پوچھے جاتے ہیں تو وہاں جس قسم کی انگریزی بولتے ہیں وہ اگر دریائے ٹیمز میں ڈھلنے کے لئے ڈالی جائے تو زبان کا تو کچھ بگڑے گا نہیں البتہ پانی گدلا ہو جائے گا۔ ہر انٹرویو کا آغاز ایک ہی سکہ بند جملے سے کرتے ہیں۔ ماں کی دعاؤں سے، قوم کی وفاؤں سے اور حکومت کی حکمت سے ہم نے یہ میچ جیتا ہے۔ اگر وہ سب کچھ ان کی وجہ سے ہوا ہے تو پھر تم نے کون سا تیر مارا ہے۔ پچاس رن بھی بن جائیں تو زمین پر اس طرح سجدہ ریز ہو جاتے ہیں جیسے دلی فتح کر لیا ہو۔ ان میں اکثریت ان کی ہے جو جمعہ کو بھی مسجد کے قریب نہیں پھٹکتے۔

عرض کیا "لگتا ہے آپ کو اب تک قومی ٹیم میں شامل نہ ہونے کا قلق ہے۔ جبھی تو کھلاڑیوں کی شان میں قصیدہ نہیں بلکہ پوری مثنوی قہر الیباں پڑھ ڈالی ہے۔"

مسکرا کر بولے "میرا تعصب اپنی جگہ لیکن ایک تلخ حقیقت سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔"

اس تناظر میں جب ملتان کو کرکٹ میچ کی میزبانی کی دعوت ملی تو رانا صاحب نے فوراً حامی بھر لی۔

ان دنوں ضلعی انتظامیہ کے بھرپور تعاون کے بغیر کوئی میچ نہیں کھیلا جا سکتا تھا۔ لاء اینڈ آرڈر کے علاوہ بورڈ کو پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے لوگوں کو کرکٹ میچ دیکھنے کا شوق تو بہت ہے لیکن پیسے دے کر ٹکٹ خریدنے کی عادت نہیں۔ اکثر اسے اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ ہر آدمی کسی نہ کسی سفارش کی تلاش میں ہوتا ہے۔ آدھا سٹیڈیم تو پولیس اور انتظامیہ اپنے بندوں کو لا کر بھر دیتی ہے پھر بورڈ کے اہلکاروں، سابق کھلاڑیوں، سیاست دانوں اور وزیروں کے دوستوں، رشتہ داروں کو شمار کر لیا جائے تو اسٹیڈیم تو بھر جاتا ہے ٹکٹ نہیں بک پاتے۔ اس خلا کو پر کرنے کے لئے انتظامیہ زبردستی ٹکٹ بیچتی ہے۔ جسے Push sale کہا جاتا ہے۔ شہر کی جتنی تاجر تنظیمیں ہیں ان کو ٹکٹوں کی کاپیاں بھجوا دی جاتی ہیں اور پیسے پیشگی وصول کر لئے جاتے ہیں۔ اصل ٹکٹ والا جب میدان میں پہنچتا ہے تو وہاں اس کی جگہ کوئی اور بیٹھا ہوتا ہے۔ وہ اگر ہاتھ میں پکڑا ہوا ٹکٹ لہراتا ہے تو کرسی پر بیٹھا ہوا

شخص اسے بازوؤں کی مچھلیاں دکھاتا ہے۔
ملتان میں ٹیم آئی ہوئی تھی۔ عمران خان کپتان تھا۔ اس نے گراؤنڈ کی حالت دیکھ کر میچ کھیلنے سے انکار کر دیا۔ ان دنوں نیا اسٹیڈیم مکمل نہیں ہوا تھا اس لئے سب میچ قلعہ قاسم باغ کے اسٹیڈیم میں ہوتے۔ اتفاق سے کچھ دن قبل ملک صلاح الدین ڈوگر وہاں فلڈ لائٹ فٹ بال ٹورنامنٹ کرا چکا تھا۔ چونکہ مہمان خصوصی میاں نواز شریف تھے اس لئے فائنل میچ کے بعد پبلک جلسے کا بندوبست بھی ہو گیا۔ فٹ بال کے بعد کرکٹ کھیلنا مشکل ہوتا ہے۔ کرکٹ نخروں نخروں اور کنگھی پٹی والا کھیل ہے جبکہ فٹ بال گراؤنڈ کھیل کا میدان کم اور اکھاڑا زیادہ نظر آتا ہے اور یہی عمران خان کا اعتراض تھا۔ وہ محض کپتان ہی نہیں بہت کچھ تھا۔ کچھ لوگ قسمت کے دھنی ہوتے ہیں یہ مقدر کا سکندر اعظم تھا۔ سکندر یونانی کے خال و خد یقیناً دلفریب ہوں گے لیکن اسے تو ہمارے میڈیا نے یونانی خداؤں کا درجہ دے دیا تھا۔ اگر باؤلنگ کے اعتبار سے دیکھیں تو یہ وسیم اکرم اور وقار یونس کا نصف بھی نہیں تھا۔ شکل و صورت میں شاہد آفریدی اور ماجد خان سے مقابل کریں تو بھی کافی پیچھے تھا لیکن حسینائیں اسے دیکھ کر کرلاتی تھیں۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس نے کون سی قابل ذکر ڈگری لے رکھی ہے، سب کہتے کہ آکسفورڈ کا پڑھا ہوا ہے۔ اس سے مل کر یہ تاثر محض وائٹ رہ گئی تھی۔ زینت امان اسٹوڈیو میں کم اور کرکٹ میدان میں زیادہ نظر آتی تھی۔ اس کے والد اکرام اللہ نیازی کہتے "پتہ نہیں لوگوں کو اس میں کیا نظر آ گیا ہے۔" آخر والد تھے، ہو سکتا ہے یہ باتیں اس نکتہ نظر سے کہتے مبادا بیٹے کو لوگوں کی نظر لگ جائے۔ ویسے اُن دنوں ہلکی پھلکی ناراضی کا ضرور اظہار کرتے۔ بتانے لگے "یہ میانوالی نہیں جاتا۔ ایک دن میں نے کہا کہ وہاں جا کر کبھی کبھی زمینوں کی دیکھ بھال کر لیا کرو۔ اگر میں مر گیا تو کیا کرو گے؟" بولا "زمینیں بیچ دوں گا۔"
اکرام اللہ نیازی اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں لیکن ان کے لاڈلے بیٹے نے زمین نہیں بیچی۔ سیاست کا چسکا اپنے Roots (جڑ) سے الگ نہیں ہونے دیتا۔
بورڈ کی منت سماجت کام آ گئی اور عمران کرکٹ میچ کھیلنے پر راضی ہو گیا۔ ہم نے جنرل حمید گل صاحب کو دعوت دی لیکن انہیں ایک ضروری کام سے راولپنڈی جانا تھا چنانچہ ان کے نائب میجر جنرل صلاح الدین ترمذی کو مدعو کیا۔ جنرل صاحب کے آنے سے پہلے ان کے سٹاف افسر نے تمام تفصیلات معلوم کیں۔ انہوں نے کس وقت آنا ہے، استقبال کون کرے گا؟ کون سی سیٹ پر بیٹھنا ہے۔ لنچ میں کوئی غیر متعلقہ شخص تو نہیں ہے۔ آخر میں اس نے ایک وارننگ بھی دے ڈالی۔ جنرل صاحب

Hyper Sensitive ہیں پراٹوکول کا خاص خیال رہے۔ احتیاط لازم است۔ ہم نے ہدایات پر من وعن عمل کیا۔ ہم سب نے ان کا استقبال کیا۔ مرکزی کرسی پر انہیں اور ان کی بیگم کو بٹھایا۔ وقفے وقفے سے ڈرنکس اور سنیکس سرو ہوتے رہے، لنچ بھی سولہ کورسز کا تھا۔ کھلاڑیوں کے ساتھ کھانا کھلایا۔ وہ بظاہر بہت خوش اور مطمئن نظر آتے تھے۔اس دن جمعہ تھا انہوں نے ملحقہ مسجد میں نماز پڑھنے کی خواہش ظاہر کی۔

میں نے کہا ''مجسٹریٹ آپ کے ساتھ جائے گا۔''

بولے''نماز ہی تو پڑھنی ہے ابھی آجائیں گے۔''

کافی دیر تک تو وہ نہ آئے، میچ شروع ہو گیا۔ پہلے تو ہم سمجھے کہ امام مسجد نے حسب دستور خطبہ لمبا کر دیا ہے پھر خبر ہوئی کہ اُن کی بیگم بھی چپکے سے اُٹھ کر چلی گئی ہیں۔ آخر میں عقدہ کھلا کہ ناراض ہو کر چلے گئے ہیں۔ دراصل ہوا یوں جب نماز پڑھ کر بریگیڈیئر اسلم کے ساتھ واپس آئے تو ڈیوٹی پر کھڑے بوڑھے تھانیدار نے گیٹ کھولنے سے انکار کر دیا۔ بریگیڈیئر اسلم نے اُسے سمجھایا کہ جنرل صاحب ہیں لیکن تھانیدار نے ایک ہی رٹ لگا رکھی تھی۔ جب تک ڈیوٹی مجسٹریٹ نہیں آئے گا میں دروازہ نہیں کھولوں گا۔ غصے میں آکر انہوں نے بیگم کو بلایا اور واپس گھر چلے گئے۔

کمشنر صاحب تو حسب عادت بری الذمہ ہو گئے، ہمیں مصیبت پڑ گئی۔ جنرل صاحب کی ناراضی تو پولیس سے تھی لیکن اس چپقلش سے ضلعی انتظامیہ کا متاثر ہونا بھی لازمی امر تھا۔ خاص طور پر ڈی آئی جی میجر مشتاق اور فوج میں ٹھن گئی۔ چھاؤنی میں فوجیوں نے پولیس کے اہلکاروں کو روکنا ٹوکنا شروع کر دیا۔ جنرل صاحب میجر مشتاق سے اس لئے بھی ناراض تھے کہ سابق فوجی ہو کر اس نے پولیس کو ڈسپلن نہیں سکھایا۔ مرزا محمد علی نے تھانیدار کو معطل کر کے انکوائری شروع کرا دی لیکن اس پر بھی ان کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ میں نے بھی انہیں کہا کہ اب جانے دیں، ایک فرد واحد کی بھول سے محکموں میں تعلقات خراب نہیں ہونے چاہئیں۔

کہنے لگے''ڈی سی صاحب! صلاح الدین ترمذی اہم نہیں ہے۔ اس کرسی کی عزت ہونی چاہئے جس پر وہ بیٹھا ہے۔ میجر مشتاق نے فون پر معذرت کی۔ آخر میں وہی نسخہ کیمیا کام آیا۔ میں نے کھانے پر سب کو بلا کر صلح کرا دی۔

رانا صاحب مسکرا کر بولے''آئندہ میچ میں محتاط رہنا۔''

عرض کیا''میرے ہوتے ہوئے اب ملتان میں کرکٹ میچ نہیں ہوگا۔''

انضمام الحق سے ملاقات: ملتان میں کرکٹ میچ تو نہ ہوا لیکن دنیائے کرکٹ میں اس کا نام روشن ہو گیا۔ پاکستان نے سڈنی میں جو ورلڈ کپ جیتا وہ گیا تو کپتان عمران خان کے

کھاتے ہیں، مگر اس کا اصل ہیرو ملتان کا باسی انضمام الحق تھا۔ سیمی فائنل اور فائنل میں جس طرح اس نے دھواں دھار بیٹنگ کی اس نے جیت ایک ہاری ہوئی ٹیم کی جھولی میں ڈال دی۔ ایک شام میں لان میں ٹہل رہا تھا کہ میرے سنتری نے بتایا کہ انضمام الحق ملنے آیا ہے۔ مجھے قدرے حیرانی ہوئی لیکن سوچا کسی ضلعے کی توقیر اور تفاخر میں ڈپٹی کمشنر کا بھی حصہ ہوتا ہے۔

ڈرائنگ روم میں چائے پر ملاقات ہوئی۔ نوجوان شرمیلا، کم گو، گول مٹول، بالکل گلیکسو بے بی لگتا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا چھوٹا بھائی بھی تھا۔ وہ بے حد باتونی اور ہوشیار تھا۔ میرے پاس جتنے تعریفی الفاظ تھے، سب اس کی نذر کر دیے۔ وہ اس کا حقدار بھی تھا۔ پاکستان نے پہلی مرتبہ ورلڈ کپ جیتا تھا۔ ہم بطور ''انڈر ڈاگ'' گئے تھے ہیرو بن کر لوٹے، ہر چند کہ عمران خان نے اپنی تقریر میں خاصی ''بونگیاں'' ماری تھیں لیکن مسرت کے ان لمحات میں ان باتوں کی کسے پروا تھی۔ چائے پینے کے بعد انہوں نے اپنی آمد کا مقصد بیان کر دیا۔ انضمام خود تو نہ بولا لیکن برادر خورد نے کہا اپنا دست شفقت مالی امداد کی صورت میں ہمارے سر پر رکھیں۔ بالفرض وہ نہ کہتا تو بھی اپنا دست جنوں جیب کی طرف بڑھنا ہی تھا۔

نواب صادق قریشی: گیلانیوں اور قریشیوں کی سیاسی چپقلش میں نواب صادق قریشی سیاست سے عملاً کنارہ کش ہو گیا تھا۔ مخدوم سجاد حسین سے قریبی رشتہ تھا لیکن وہ ان کی طرح زیرک اور زمانہ ساز تھا اور نہ اسے لوگوں کو شیشے میں اُتارنے کا فن آتا تھا۔ مخدوم سجاد اس میدان میں یکتا تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ضیاالحق انہیں اپنے ساتھ ہندوستان لے گیا۔ وہاں جب وزیراعظم راجیو گاندھی سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے جواہر لعل نہرو سے اپنی دیرینہ دوستی کا ذکر چھیڑ دیا۔ پنڈت جی کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ وہ بڑے غور سے ان کی چکنی چپڑی باتیں سنتا رہا۔ انہوں نے جب اسے بتایا کہ اس کی پیدائش پر پنڈت جی نے اسے بلوا کر مخدوم صاحب سے اس کے کان میں خصوصی دعا پھنکوائی تھی تو وہ اس قدر متاثر ہوا کہ عملاً مخدوم صاحب کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ ضیاالحق حیران پریشان اس نئی تعلق داری کو دیکھتا رہا۔

صادق قریشی طبعاً بھی نواب تھا۔ تساہل پسند، کم گو، عیش و آرام کی زندگی کا خوگر اور خواہاں۔ یہ درست ہے کہ وہ پیپلز پارٹی کا سرکردہ رہنما تھا۔ گورنر پنجاب اور وزیراعلیٰ بھی رہا لیکن اس کی وجہ سیاست نہیں بلکہ بھٹو سے ذاتی مراسم تھے۔ اس دوستی کی وجہ سے پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کی۔ پارٹی کی وجہ سے الیکشن جیتا اور ذاتی تعلق کی بنا پر اعلیٰ منصب تک جا پہنچا۔

[جاری ہے۔]

آگے آگے مرا ادراک چلا جاتا ہے

شاعرِ امروز

آرب ہاشمی

شاہد ماکلی

آرب ہاشمی کی شاعری پڑھتے ہوئے جو بات سب سے پہلے ہماری توجہ اپنی طرف کھینچتی ہے، وہ ان کے ہاں نئے معنی کی تلاش کا رجحان ہے؛ اپنے اردگرد پھیلے ہوئے انفاس و اشیاء کو جاننے اور سمجھنے کی رغبت ہے؛ ملفوف مناظر و مظاہر کی حقیقتوں کو اَن فولڈ کرنے کی سعی ہے۔ یہ تجسس یہ کرید ان پر کئی بھید منکشف کرتا ہے۔ انھی انکشافی لمحوں میں ان کے ہاں تخلیق کا عمل وقوع پذیر ہوتا ہے۔ وہ اپنے اس باطنی تجربے کے ثمرات سے نہ صرف خود مسرت (اور اذیت) کا رنگ رس کشید کرتے ہیں بلکہ اس کشید کے ذائقوں میں اپنے قاری کو بھی شریک رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں نہ تو گزرے ہوئے دنوں کے گہرے حزن و ملال کی چھاپ ہے اور نہ آنے والے دنوں کے گونا گوں اندیشوں کے سائے ہیں بلکہ ان کی شاعری ماضیت (pastness) اور آئندگی (futureness) کے مابین ایک ایسے تخلیقی و زمانی منطقے میں تشکیل پاتی ہے جس کی آب و ہوا ان کی ذہنی ساخت و پرداخت، وجدان اور طبع سے فطری مطابقت رکھتی ہے۔ یہاں سے وہ ایک ایسے ناظر کی حیثیت سے اپنے تحت وفوق اور پس و پیش پر نظر ڈالتے ہیں جو اپنے دیدہ و دل میں کئی حیرتیں، کئی روحانی الجھنیں اور کئی سوال لیے کھڑا ہے۔ آرب ہاشمی کی شاعری انھی الجھنوں اور سوالوں کے حل ڈھونڈنے کے سفر کا تفہیم نامہ ہے۔

پیچھے رہ جاتے ہیں سب ارض و سماوات آرب
آگے آگے مِرا ادراک چلا جاتا ہے

آرب ہاشمی 10 دسمبر 1991 کو گجرات میں پیدا ہوئے۔ سولہ سال کی عمر میں 2007 سے شعر گوئی آغاز کی۔ ایم اے اردو ہیں۔ نجی کاروبار سے منسلک ہیں۔ اعتکاف کے نام سے پہلا شعری مجموعہ اشاعت کے مراحل میں ہے۔ ذیل میں ان کا شعری انتخاب:

اب تو وہ لوگ بھی ملنے کو چلے آتے ہیں
بات کرنے کو جو تیار نہیں ہوتے تھے

میں ایک تیر تھا اس کی کمان میں رکھا
اور اس نے یونہی ہوا میں چلا دیا ہے مجھے

اب مری نیند کے رستے میں کھڑے رہتے ہیں
چند سائے جو مرے خوف سے تیار ہوئے

ہجر دے کر تو سبھی مار دیئے جاتے ہیں
ہائے وہ شخص جسے چھوڑ دیا جاتا ہے

گھر سے نکلا ہوں میں وحشت کے سفر پر آرب
میرے ہمراہ مری چاک گریبانی ہے

جو درد ہم نے سنبھالا تھا اپنے سینے میں
کسے سناتے ، کوئی مہرباں نہ ملتا تھا

عین ممکن ہے چراغوں سے مدد لی جائے
آج کی رات ستاروں پہ بہت بھاری ہے

وگرنہ کون محبت یہاں نبھا پاتا
خدا کا شکر ، جدائی کا راستہ نکلا

طویل رات تھی، اس کو سلا کے سویا تھا
اور اس نے خواب میں جا کر جگا دیا ہے مجھے

ہم اسے بحر میں ڈھلنے نہیں دیتے ورنہ
خامشی لہر میں آجائے تو آہنگ لگے

اب تو کوئی بھی نہیں، حال سنائیں جس کو
مدتیں ہو گئیں بے یار و مددگار ہوئے

عین ممکن ہے قبیلے میں بغاوت ہونا
عین ممکن ہے ترے نام پہ اک جنگ لگے

تو جو بچھڑا تو کسی اور کا ہو جاؤں گا میں
اور کیا تجھ سے بچھڑنے میں پریشانی ہے

تا دمِ مرگ سیہ پوش ہمیں رہنا ہے
یعنی ہم لوگ تو پیدا ہی عزادار ہوئے

اسے خبر ہی نہیں تھی وہ کس جہان میں تھا
کھلی فضا تھی، پرندہ کھلی اڑان میں تھا

تیری صورت سے نکھرتا ہے پس و پیش اس کا
تو نہ دیکھے اگر آئینہ، اسے زنگ لگے

اسے میں دیکھ رہا ہوں تمہارے سینے میں
وہ ایک تیر جو اب تک مری کمان میں تھا

نیند میں سر کو جھٹکتے ہوئے سوچا میں نے
کیسے نکلا وہ مرے خواب سے کیوں نکلا ہے

عرصہ ہجر میں ہم لوگ یہیں ہوتے تھے
یہ جو موجود ہیں منظر پہ نہیں ہوتے تھے

درونِ خواب تھے چھالے ہمارے پاؤں میں
پھر اس کے بعد حقیقت میں گھر سے نکلے تھے

ماننے والے تو بس مان لیا کرتے ہیں
ماننے والوں کو اس بات کی آسانی ہے

شاخ پر کھلتے ہوئے پھول کی رنگت دیکھو
اس کو معلوم نہیں ہوگا خزاں آنی ہے

سانس لینے کی یہ ترتیب ہوئی تیرے بعد
رات کو نوحہ پڑھا ، دن کو عزاداری کی

وہ ایک فالتو کردار تھا کہانی کا
سو اس کو زہر دیا جا رہا تھا کھانے میں

اس کے لفظوں سے چھلکتا ہے یزیدی لہجہ
وہ جو ہر بات پہ کہتا ہے کہ سادات ہیں ہم

اک ایک کر کے سبھی راستے میں مارے گئے
جو لوگ تیری حفاظت میں گھر سے نکلے تھے

تو جہاں ڈگمگا رہا ہو گا
ہم ترے ساتھ چل رہے ہوں گے

جن دنوں خواب لٹاتی تھیں یہ آنکھیں آرب
ان دنوں اتنے خریدار نہیں ہوتے تھے

☆☆☆☆☆

غزل

یہ ہاتھ ہیں کچھ برتے سے یہ ساتھ ہیں کچھ دیکھے سے
یہ دن تو نہیں دیکھا سا، حالات ہیں کچھ دیکھے سے

وہ رات بھی تو گزراں تھی، یہ دن ہے بھی تو گزراں ہے
یہ رُت تو اسی رُت سی ہے، دن رات ہیں کچھ دیکھے سے

یہ گیت یہیں اُترا تھا، یہ رنگ یہیں برسا تھا
صدے ہیں یہ کچھ جھیلے سے، جذبات ہیں کچھ دیکھے سے

وہ تان یہیں ٹوٹی تھی، یہ سانس یہیں بکھرے تھے
اے برگِ شکستہ پائی! صدمات ہیں کچھ دیکھے سے

تحریر ذرا پہچانو! کس دُھن میں ہو اے دیوانو
دیواروں پہ اس باراں کے اشحات ہیں کچھ دیکھے سے

کچھ زور تو دو ذہنوں پر، وہ ہاتھ ہیں پھر آنکھوں پر
یہ لمس شناسا سا ہے، یہ ہاتھ ہیں کچھ دیکھے سے

وہ چاند جہاں بچھڑا تھا، وہ موڑ تو پھر آ نکلا
وہ صبح یہیں ٹھہری تھی، لمحات ہیں کچھ دیکھے سے

خالد احمد

غزل

جہاں شورِ قیامت تھا وہاں ، چُپ
بھڑک کر ہو گیا آتش فشاں چُپ

درونِ محویت یہ دھیان کس کو
ہُوا کیوں داستاں گو ناگہاں چُپ

کبھی دیکھا نہ تھا قتلام ایسا
ہے کتنے روز سے سارا گراں چُپ

ہماری جان لے جاتی ہے تن سے
تمہاری گفتگو کے درمیاں ، چُپ

کبھی بھولے سے اُس کو چھیڑ بیٹھو
وہ ہوتا ہے کسی سے پھر کہاں چُپ

یہاں ممنوع تھا جب حرفِ تکبیر
ہوئی دل میں کہاں تب بھی اذاں چُپ

جوابی تیر اک تولا نہ ہم نے
تو آخر ہو گئی اُس کی کماں چُپ

حقیقت آپ کھل جائے گی آخر
ہر اک بہتان پر اپنا بیاں، چُپ

میں جتنا بولتا جاتا ہوں عالی
دروں ہوتی ہے اتنی ہی جواں چُپ

جلیل عالی

غزل

قلب و جاں پر کوئی زوال نہ ہو
اے خدا! گھر یہ پائمال نہ ہو

زندہ رہنا ہے دوریوں میں بھی
مر نہ جائیں اگر وصال نہ ہو

ہے یہ اچھا کہ خود پہ کھل جائیں
غمِ دنیا کا احتمال نہ ہو

ہے تمنا خود آگہی سے جئیں
سرنگوں ہو کے کچھ سوال نہ ہو

عہدِ ماضی کہ حال و مستقبل
بے اماں کوئی ماہ و سال نہ ہو

چشمِ حیراں ہو چار سو نگراں
زخم وہ جس کا اندمال نہ ہو

آن قائم رہے بہر صورت
جان جائے تو کچھ ملال نہ ہو

کوئی اک بات، کوئی دل کی بات
بات ہو اس میں قیل و قال نہ ہو

دل کے آنگن میں چاندنی اترے
آنکھ سے دور وہ جمال نہ ہو

مظہرِ ذات کا ہنر مانگوں
اور درکار کچھ کمال نہ ہو

خواہشِ رزق ہو بہت ارزاں
نارسا ہو، اگر حلال نہ ہو

ہو کمالِ ریاض، خوش آثار
شیشۂ دل میں کوئی بال نہ ہو

سید ریاض حسین زیدی

غزل

سبو و جام بہ قیمت لیے ، بزور نہیں
حرام نوش سہی ہم ، حرام خور نہیں

کہاں وہ شہرِ تمنّا جو تھا کبھی آباد
سکوت گونج رہا ہے، گھروں میں شور نہیں

ہَوا کے رحم و کرم پر ہیں، یاالٰہی! ہم
کسی کے ہاتھ میں شاید ہماری ڈور نہیں

نہ ایک بے کس و مجبور کو کہو مجرم
ضرورۃً کوئی چوری کرے تو چور نہیں

کوئی بعید بھی ہو، پُرکشش بھی میرے لیے
تو کیا وہ چاند نہیں اور مَیں چکور نہیں

جو آئے حصّہ و حق سے زیادہ تیرے پاس
وہ دوسروں کے لیے چھوڑ دے، بٹور نہیں

کہاں سے آئی، کہاں جا رہی ہے، کیا معلوم
ہمارے سامنے دنیا کا اور چھور نہیں

اُتارتے ہیں جہاں لوگ عمر بھر کی تھکن
زمیں کی گود ہے وہ اے شعورؔ! گور نہیں

انور شعورؔ

غزل

آسمانوں پہ اچھالے ہوئے ہم تھے ہی نہیں
خوش نصیبی ترے پالے ہوئے ہم تھے ہی نہیں

زور بازو سے کیا پار سمندر شب کا
اس کی موجوں کے سنبھالے ہوئے ہم تھے ہی نہیں

ہر قدم ساتھ رہا سر پہ چمکتا سورج
چاند تاروں کے اجالے ہوئے ہم تھے ہی نہیں

آج تک ہم نے کیا یاس کے صحرا سے گریز
اس کی وحشت کے حوالے ہوئے ہم تھے ہی نہیں

عمر بھر چلتی رہی دانہء گندم کی تلاش
جیسے جنت سے نکالے ہوئے ہم تھے ہی نہیں

رزق امید کی دنیا سے لیا جتنا لیا
اپنے حالات کے پالے ہوئے ہم تھے ہی نہیں

اشک پیتے ہوئے غم کھاتے ہوئے بیت گئی
زندگی تیرے حوالے ہوئے ہم تھے ہی نہیں

جس طرف وہ تھا وہی ایک طرف تھی اپنی
ہر طرف دیکھنے والے ہوئے ہم تھے ہی نہیں

کتنے بے سمت اشاروں پہ کنور چلتے رہے
اپنی دانست میں ڈھالے ہوئے ہم تھے ہی نہیں

اعجاز کنور راجہ

غزل

[نذرِ خالد احمد]

بس ایک موڑ پہ آ کر ٹھہر گئے ہم بھی
"نہ اُس نے راستہ بدلا نہ گھر گئے ہم بھی"

ٹھہر نہ پائے کہیں جب، گزر گئے ہم بھی
جو اَور سب نے کیا تھا، وہ کر گئے ہم بھی

اُسے سَدا کے لئے الوِداع کہنا تھا
سو ایسا کرنے کو با چشمِ تَر گئے ہم بھی

کسی عزیز کے مرنے پہ یوں ہوا محسوس
کہ جیسے زندہ نہیں ، جیسے مر گئے ہم بھی

جو سطحِ آب پہ ہم کو کوئی سکوں نہ مِلا
سمندروں کی تہوں میں اُتر گئے ہم بھی

یہ اَور بات، خسارہ سب اپنے نام لکھا
حسابِ سود و زیاں کچھ تو کر گئے ہم بھی

یہی تھی شرط کہ لمبی اُڑان بھرنی ہے
سو لے کے ٹوٹے ہوئے بال و پَر گئے ہم بھی

ہَوا چراغ بجھاتی ہی جا رہی تھی نسیم
نہ تھے چراغ ، مگر کتنے ڈر گئے ہم بھی!

نسیمِ سحر

غزل

جب یہ سنہرے دن بدلیں، تم ایک طرف ہو جانا
جب مجھ پر پتھر برسیں، تم ایک طرف ہو جانا

جنھیں ہوا کے رُخ پر چلنا اچھا لگتا ہے
لاکھ تمھارے ساتھ چلیں، تم ایک طرف ہو جانا

مجھے تو اِن دیواروں سے ٹکرانا ہے اِک دن
لوگ اگر تم سے اُلجھیں، تم ایک طرف ہو جانا

دُور کسی سنسان جزیرے میں جا کر رہ لینا
شہر اگر رستہ نہ دیں تم ایک طرف ہو جانا

گرم رُتوں میں پھولوں جیسے چہرے، جانِ انیس!
جب شعلے بن کر دہکیں، تم ایک طرف ہو جانا

محمد انیس انصاری

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس رخ سے تیری مدح، ترے مدح جُو کریں
کس تار سے حروف کے دامن رفو کریں

غزل

جی رہا ہوں جو جی لگا کر میں
مر نہ جاتا تجھے بھلا کر میں

تھام کر اُس کے ہاتھ دیکھوں گا
اپنی تقدیر آزما کر میں

مت سمجھنا کہ بول سکتا نہیں
سن رہا ہوں جو سر جھکا کر میں

اس کی رعنائی دیکھنی ہو تو
دیکھتا ہوں دیے بجھا کر میں

جاگتا خاک پر ہوں روزانہ
خواب میں کہکشاں بنا کر میں

جرم کس نے کیا ہے کس نے نہیں
پھنس نہ جاؤں کہیں بتا کر میں

پیڑ پر جو بنائے تھے دو دل
توڑ دوں کیا انہیں مٹا کر میں

اس لیے دل پہ لگتی ہے راحتؔ
بات کرتا نہیں گھما کر میں

راحت سرحدی

غزل

اس طرح اب کے مال کھینچتے ہیں
زندہ جسموں سے کھال کھینچتے ہیں

گھٹ ہی جاتا ہے دَم پرندوں کا
اتنی شدت سے جال کھینچتے ہیں

سوچتے ہیں عزیز بوڑھوں کے
دیکھیے کتنے سال کھینچتے ہیں

وہ مدرّس ہوں یا کہ مُلّا ہوں
پھول بچوں کے گال کھینچتے ہیں

جھڑکیاں کھا کے آئیں دفتر سے
گھر میں بیوی کے بال کھینچتے ہیں

چاہے عُشاق جس قبیل کے ہوں
مستیاں حسبِ حال کھینچتے ہیں

دل کھچیں ساتھ ہی پتنگوں کے
ڈور خوباں کمال کھینچتے ہیں

بانٹتے ہیں جو راحتیں گلزار
خود وہ رنج و ملال کھینچتے ہیں

گلزار بخاری

غزل

دروازہ مرا ایک زمانے سے کھلا ہے
لیکن مرا گھر آپ کے آنے سے کھلا ہے

اک تو ہی نہیں میں بھی محبت کے ہوں لائق
مجھ پر یہ ترا ساتھ نبھانے سے کھلا ہے

کچھ حسن کا زعم اور جوانی کا تکبر
مجھ سے وہ بہت حیلے بہانے سے کھلا ہے

اس طرح گیا وقت پھر آتا ہے پلٹ کر
یہ مجھ پہ ترے لوٹ کے آنے سے کھلا ہے

تعبیر مرے پاؤں کی زنجیر بنی ہے
وہ خواب کہ جو مجھ پہ سرھانے سے کھلا ہے

صفدر صدیق رضی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دل دھڑکنے پہ بھی آمادہ نہ پایا خالد
ہر نفس گوش بر آواز خدا اپنا تھا

غزل

خود کو ہر طرح چھان کر دیکھا
ایک پُتلا ہی خاک کا نکلا

گھر کے دُکھڑے ہی سب سُناتے ہیں
کوئی دیوار کی نہیں سُنتا

دھوپ سر پر اُٹھائی ، تب جا کر
سایہ پاؤں سے آن کر لپٹا

موجِ دریا کا یہ چلن تھا کہاں
ہے اثر تیری خوش خرامی کا

ہم جہاں موتیوں کی تاک میں تھے
وہیں دریا نے ہم کو آ نگلا

ٹمٹمانے لگا چراغِ عمر
ختم اَب روغنِ شباب ہُوا

کب بنایا نیا جہاں مَیں نے
وہ ہٹایا ہے جو پرانا تھا

اجنبی ہُوں دکانِ دُنیا پر
بھول بیٹھا ہُوں کیا خریدنا تھا

جسم کی لالٹین جونہی بجھی
رُوح میں اِک چراغ جل اُٹھا

وحشتیں کھوجتی رہیں مجھ کو
کچھ بھی صحرا سوا نہیں نکلا

ایک گرداب کی کمی تھی فقط
اَب مکمل ہے عشق کا دریا

میرے ہتھیار کام آ نہ سکے
خوف اندر سے مجھ کو مار گیا

خاور اعجاز

غزلیں

کس کس کو بتاتا پھروں، اچھے سے نہیں کی
بس زندگی کاٹی ہے، سلیقے سے نہیں کی

ہر لفظ دعا زاد تھا، بیکار گیا ہے
دونوں نے دعا کوئی بھی سینے سے نہیں کی

کیا گزری ہے خوابوں کے پرندوں کو اڑا کر
یہ بات کبھی آنکھ کے پنجرے سے نہیں کی

کچھ ہجر نبھایا ہے تو کچھ وصل سمیٹا
رونق یہ بپا، عشق تماشے سے نہیں کی

یہ آنکھ نمایاں ہوئی اک رنگِ دِگر سے
زخمی یہ کسی کانچ کے ٹکڑے سے نہیں کی

حسرت میں رکھا تجھ کو، مگر کوئی شکایت
میں نے تو ترے آئینہ خانے سے نہیں کی

دنیا نے رویہ مرا پہچان لیا تھا
پھر اُس نے کوئی بات بھی نخرے سے نہیں کی

قیوم طاہر

جسم، رنگیں قبا کی صورت ہے
دل، مگر اک خلا کی صورت ہے

دورِ فرعون لوٹ آیا ہے
ہر کوئی یاں خدا کی صورت ہے

چھوڑ رکھا ہے مانگنا ہم نے
اب دعا، بددعا کی صورت ہے

شب گزرتی ہے جلتے بجھتے ہوئے
جو دیا ہے، ہوا کی صورت ہے

اک کھلی جیل، اُس کی مرضی کی
زندگی تو سزا کی صورت ہے

میں بھی پتھر، صدا بھی پتھر ہے
راہ، کوہِ ندا کی صورت ہے

سخت مٹی کو، کچھ تو نرم کیا
مجھ میں کچھ تو گھٹا کی صورت ہے

غزل

یہ نہیں کہ اس پہ کہا اثر نہیں کر رہا
وہ تو کوئی کام بھی سوچ کر نہیں کر رہا

ترے فیصلوں پہ کوئی بھی شہر میں خوش نہیں
میں یہ بات اپنے ہی طور پر نہیں کر رہا

اسے اپنے کرنے کی سب خبر ہے یقین کر
وہ جو کر رہا ہے وہ بے خبر نہیں کر رہا

یہ حقیقتیں ہیں جو کر رہا ہوں بیان میں
کسی راز سے تجھے باخبر نہیں کر رہا

میں خود اپنی مرضی سے کر رہا ہوں یہ خودکشی
میں یہ فیصلہ کسی جبر پر نہیں کر رہا

تو گزر بسر کے لئے نہ خود کو عذاب دے
ترے سامنے میں گزر بسر نہیں کر رہا

تجھے ساتھ کیسے میں لے چلوں، شب تار ہے
میں تو ساتھ سایہ بھی ہم سفر نہیں کر رہا

کوئی بات ہے، مرے دیس میں، کئی سال سے
جو اندھیری رات کی وہ سحر، نہیں کر رہا

اکرم ناصر

غزل

آنکھ میں رکھے ہوئے ہر خواب کو زنجیر کر
نیند میں جا کر کسی دن ہجر کی تفسیر کر

زندگی کتنی بھیانک تلخیوں کا زہر ہے
مرنے والوں کی رگوں کو آخری تحریر کر

ڈوبنے والا لہو میں تر ہے اُس پہ آنکھ رکھ
پانیوں پر تیرتے منظر کو اب تصویر کر

یہ بقا اپنی فنا کے ساتھ جب مشروط ہے
زندگی سے سُر ملا اور موت کو تسخیر کر

زندگی جہدِ مسلسل سے بدلنا سیکھ لے
پھر بہارِ جاوداں کی خون سے تعمیر کر

آنے والی نسل آزادی کا مطلب جان لے
تُو مری سانسوں کو وقفِ حرمتِ کشمیر کر

کر کبھی اقبال کو دُرویش کی مسند عطا
پاؤں سے باندھے ہوئے اِس رقص کو تعبیر کر

اقبال سروبہ

غزل

افسانۂ حیات سنانے سے پیشتر
میں رو پڑا تھا کچھ بھی بتانے سے پیشتر

اچھا یہی ہے تو درِ زنداں بھی کھول دے
سوئے ہوئے پرند جگانے سے پیشتر

نقشے میں اس کے کوئی ہوا دان ہی نہیں
سوچا نہ تھا مکان بنانے سے پیشتر

لازم ہوا کہ مجھ سے اجازت طلب کرے
مجنوں بھی دشت کی طرف آنے سے پیشتر

اُس نے میرا سوال سنا ہی نہیں بغور
طالبؔ کوئی جواب بنانے سے پیشتر

طالب انصاری

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مَیں کَل کا آدمی ہُوں، مجھے کَل پہ ٹال دے
اَے دن! مجھے زوال کی حَد سے نکال دے

غزل

پہلے سارے دیے بجھائے گئے
پھر اندھیروں کے گیت گائے گئے

ساحلوں تک پہنچ نہیں پائے
موج در موج ہم بہائے گئے

کیسے کیسے جھول سینوں پر
تمغہ ہائے خرد سجائے گئے

منزلیں جب ذرا قریب آئیں
فاصلے اور بھی بڑھائے گئے

جانے کب لوٹ کر وہ آئیں گے
آسمانوں پہ جو اٹھائے گئے

لوگ کہتے ہیں تیری محفل میں
شعر میرے سنے سنائے گئے

جو نہ جاتے تھے بن بلائے کہیں
تیری محفل میں بن بلائے گئے

خود کو غالبؔ نہ تو سمجھ باقیؔ
تیرے جیسے ہزار آئے گئے

باقی احمد پوری

غزل

ایک احساس جو تلوار سے آگے نکلا
اشک بن کر مرے اظہار سے آگے نکلا

خود مصنف نے اسے لا کے کہیں مار دیا
ایک کردار جو کردار سے آگے نکلا

اس کو لے آئی سرِ دار، تمنا اس کی
عشق تو عشق تھا، بازار سے آگے نکلا

ظلمتِ شب میں کوئی دیپ لیے نکلا تھا
ایسے رستے پہ، جو انکار سے آگے نکلا

وقت آیا تو کھلا مجھ پہ کہ دنیا کیا ہے
جو مرا یار تھا، اغیار سے آگے نکلا

اور تیزی سے وہ انجام کو پہنچا اپنے
جو کوئی وقت کی رفتار سے آگے نکلا

سعد حیران ہوں میں سادہ دلی پر تیری
نام قاتل کا تو تکرار سے آگے نکلا

سعد اللہ شاہ

غزل

آنکھ تھک جائے یہ منظر یونہی چلتا جائے
اک دیا خانۂ احساس میں جلتا جائے

یہ بھی ممکن ہے کہ میں راستہ دیکھے جاؤں
میرا مہتاب کہیں اور ہی ڈھلتا جائے

جاتے جاتے یہ نشاں ڈوبتے خورشید کا تھا
جیسے تانبا کسی جذبے سے پگھلتا جائے

اب تو لگتا ہے کہ گویا وہ مرا تھا ہی نہیں
جس طرح خواب نگاہوں سے پھسلتا جائے

اُس شبِ وصل کا احساس بیاں کیسے ہو
موم جیسے کوئی تصویر میں ڈھلتا جائے

چودھویں رات کا چاند آنکھ میں اُترا تابش
باغ میں جیسے کہ سایہ سا ٹہلتا جائے

تابش کمال

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مری بات کہتے رہنا ، یہ قلم اُٹھائے رکھنا
یہ علَم فرو نہ کرنا ، یہ فلک سجائے رکھنا

غزل

ہم نے کہنا ہے ، جو نہیں کہتے
آپ کہتے ہیں ، لو ! نہیں کہتے

آپ کو بے وفا کہیں اور ہم؟
کہنا بنتا ہے گو نہیں کہتے

کس کو کہتے کہ سُنیے حالِ دل؟
ہم اگر آپ کو نہیں کہتے

آپ کے بارے میں مرے اشعار
وہ بھی کہتے ہیں جو نہیں کہتے

آپ سے گفتگو بہانہ ہے
ورنہ ہم شعر تو نہیں کہتے

اک غزل جو کہی نہیں ہم نے
آپ کہتے ہیں سو نہیں کہتے

وہ جو کہتے ہیں دل نہیں سُنتا
دل جو سُنتا ہے وہ نہیں کہتے

روز کہتے ہیں ہم کہیں تم سے
جانے کیا ہے کہ جو نہیں کہتے

دل ملے ہوں تو دو نفوس کو ہم
ایک کہتے ہیں دو نہیں کہتے

آپ کو سچ نہیں لگا ورنہ
ہم کوئی جھوٹ تو نہیں کہتے

مرگِ جاناں ہے مرگِ قلبِ سلیم
لفظ ایسے سنو! نہیں کہتے

محمد سلیم ساگر

غزل

یہ کائنات کی تجسیم کا معاملہ تھا
اور اک چراغ کھڑا میری سمت دیکھتا تھا

کہیں کہیں تو کوئی بات ہی نہ بن پائی
کہیں کہیں مرا خود سے مکالمہ ہوا تھا

کسی کو اپنی طرف دیکھنے کی چاہ نہ تھی
میں شہر بھر سے اکیلا الجھتا پھرتا تھا

وہ بار بار سنا ہے ، مرا بھی پوچھتا تھا
میں اس سے کتنا خفا ہوں، اسے بتانا تھا

کہانی کار گریزاں تھا میرے نام سے اور
کسی بہانے مرا ذکر آ ہی جاتا تھا

نوید چپ تھا ، اسے بولنے کی خو نہیں تھی
یہ سارا شہر اسے بے جواز جانتا تھا

نوید صادق

غزل

فلک پر چاند سورج کیا ستارہ بھی نہیں کوئی
کہیں نیلے سمندر کا کنارا بھی نہیں کوئی

بہت آسان ساحل ہے کہ ہم تم ایک ہو جائیں
تمہارا بھی نہیں کوئی ہمارا بھی نہیں کوئی

سفر سارے کا سارا ہے کئی گہری گفاؤں میں
کسی جگنو کی جانب سے اشارہ بھی نہیں کوئی

سو یہ بیساکھیاں بھی تو خدا کے آسرے پر ہیں
ہمارے بعد اب ان کا سہارا بھی نہیں کوئی

یہاں دونوں طرف سے ہے وہی ٹکر برابر کی
اگر جیتا نہیں کوئی تو ہارا بھی نہیں کوئی

مشینوں کی طرح ہم اور کتنا ساتھ رہ لیتے
عداوت بھی نہیں ہے بھائی چارہ بھی نہیں کوئی

اثاثے اور کیا ہونگے یہی دو چار سانسیں ہیں
ہمارے پاس اپنا کیا ادھارا بھی نہیں کوئی

ہمیں چلنا پڑے گا آپ ہی اپنے اشاروں پر
سدھایا بھی نہیں کوئی سدھارا بھی نہیں کوئی

گلا ان آنسوؤں کا اور کتنی بار گھونٹیں گے
ہمارے ضبط کا مسعود یارا بھی نہیں کوئی

مسعود احمد

غزل

راہ تکتی ہے دن کی تنہائی
کب سے ٹوٹی پڑی ہے شہنائی

وہ مری روح سے لپٹتی ہے
کیسی پوشاک تو نے پہنائی

ہے وہ دل میں بسا ہوا ہر دم
کیسے کہہ دوں اسے میں ہرجائی

ان کا جلوہ کہیں ہوا ہو گا
آنکھ میں برق سی ہے لہرائی

دم بخود ہیں کمالِ قدرت سے
دیکھ کر ان کی بزم آرائی

زلف ان کی کہیں کھلی ہو گی
رقص کرنے لگی ہے پُروائی

آگہی کا مزا نرالا ہے
دو کٹورے وہ آج بھر لائی

کیسے سہتا ستم قیامت کے
آئنے پر پڑی تھی انگڑائی

دیکھ کر مجھ کو منتظر تیرا
چشمِ نرگس بھی آج شرمائی

دیکھ کر یوں اداس تم کو اویس
رُت بہاروں بھری بھی کمہلائی

اویس الحسن

غزلیں

جو آس پاس ہے میرے عجب نہیں کچھ بھی
اُداس ہونے کا یونہی سبب نہیں کچھ بھی

غموں نے تیرے مجھے بے نیاز کر ڈالا
تری جدائی کی رُت میں طلب نہیں کچھ بھی

بس ایک ترکِ محبت کی راکھ ہے دل میں
کبھی تھے اُس سے مراسم پر اب نہیں کچھ بھی

میں چور چور ہوا زندگی کے زخموں سے
کہیں بھی سلسلۂ روز و شب نہیں کچھ بھی

شفیق احمد خان

شہر والوں سے جدا تھے شہر میں رہتے ہوئے
کٹ گئی ہے عمر غم کی لہر میں رہتے ہوئے

ہر گھڑی دل میں ادھوری خواہشوں کی ہے خلش
کوئی کیسے خوش رہے اس دہر میں رہتے ہوئے

رفتہ رفتہ تلخ سے ہم تلخ تر ہوتے گئے
روز و شب اک بے بسی کے زہر میں رہتے ہوئے

وہ بار بار مرے ذہن کو کریدتا ہے
بتاؤں کیا میں اُسے بات جب نہیں کچھ بھی

کسی کے ہجر نے سب رنگ روپ چھین لیا
رخِ فسردہ پہ وہ تاب و تب نہیں کچھ بھی

شفیقؔ وقت نے پل میں بدل دیا سب کچھ
کبھی ملالِ مسلسل تھا اب نہیں کچھ بھی

ہجر میں شام و سحر اک تیرگی ہمراہ تھی
دل کی شمعیں بُجھ گئیں اک قہر میں رہتے ہوئے

اَبر اک بیگانگی کا دل پہ چھایا تھا شفیقؔ
ہم گریزاں خود سے تھے اِس شہر میں رہتے ہوئے

غزل

کیا عجب دنیا ہے اپنی کیا عجب دستور ہے
کل وہی گم نام ہو گا آج جو مشہور ہے

شیشۂ دل پتھروں میں بھی سلامت ہے کبھی
اور کبھی اک پھول سے چھو کر بھی چکنا چور ہے

میرے دل کی کیا تمنا ہے نہ پوچھو مجھ سے تم
دل سے اپنے پوچھ لو کیا یہ تمھیں منظور ہے

راہِ حق پہ چلتے چلتے منزل آئی کون سی
دار کی رفعت پہ استادہ پھر اک منصور ہے

سانس میں شامل ہے لیکن پا نہیں سکتا اُسے
وہ مرے نزدیک اتنا رہ کے بھی مستور ہے

میتھیو محسن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پریشاں رو ، کسی پہلو نہیں تھا
ترا غم موجۂ خوشبو نہیں تھا

غزلیں

جمالِ حسن سے بڑھ کر کوئی جمال نہیں
ترے خیال سے آگے کوئی خیال نہیں

تمہارے عارض و گیسو بھی خوبصورت ہیں
مگر یہ حسنِ تکلم، اِسے زوال نہیں

کچھ اس لئے بھی سماعت کے بادباں نہ کھلے
تمہاری رام کہانی جو حسب حال نہیں

ہمیں تو دہری اذیت کا سامنا ہی رہا
وہاں پہ ہجر نہیں ہے یہاں وصال نہیں

میں ایک ایسے قبیلے کا فرد ہوں شاہدؔ
جسے چراغ کے بجھنے کا بھی ملال نہیں

افتخار شاہد

بچھڑنے والے تمہیں بھی ملال ہے کہ نہیں
تمہارے دل میں بھی میرا خیال ہے کہ نہیں

اگر میں قامتِ زیبا کا کھینچ دوں نقشہ
بتا یہ میرے ہنر کا کمال ہے کہ نہیں

تمہارے عارض و گیسو تو خوب ہیں لیکن
دل و نظر میں بھی حُسن و جمال ہے کہ نہیں

طلب کا کوئی سلیقہ نہیں مگر آقا
ترا غلام سراپا سوال ہے کہ نہیں

دیارِ حُسن کی رونق تو ماند ہے شاہدؔ
سراجِ شوق تجھے بھی زوال ہے کہ نہیں

غزل

نظام ایسے نہیں اُلٹا ہوا ہے
ہوس نے کام اپنا کر دیا ہے

سُنائی دے رہی ہیں اب بھی چیخیں
نہ جانے کب کا دریا سو گیا ہے

تو کیوں سچائی پر پردے پڑے ہیں
ہمارے رُوبرو گر آئینہ ہے

الٰہی آبرو رکھنا چمن کی
وہ پھر صیاد بن کر آگیا ہے

کسی کے واسطے سوچے گا وہ کیا
وہ جس کی سوچ پر پہرا لگا ہے

تجھے دل میں بساؤں کس طرح جب
مرے دل میں خدا ٹھہرا ہوا ہے

بدلتے ہیں فقط کردار شاہدؔ
تماشا تو مسلسل ہو رہا ہے

ہمایوں پرویز شاہد

غزلیں

کیا رنگ دکھائے ہیں تُو نے شبِ تنہائی
ہم خود ہی تماشا ہیں اور خود ہی تماشائی

وہ ناز کے ایواں میں بیٹھے ہیں خدا بن کر
محرومِ تمنا ہے جذبوں کی جبیں سائی

نظروں کے تصادم سے! وہ چوٹ لگی دل پر
دل میں جو تمنا تھی آنکھوں میں سمٹ آئی

پہلے نہ کُھلا مجھ پر یہ رازِ محبت کا
"آغاز بھی رُسوائی انجام بھی رُسوائی"

جس دور کے منصف پر پہرے ہوں صلیبوں کے
اُس دور کے دارا کی لُٹ جاتی ہے دارائی

اَب مجھ کو گوارا ہیں سب جور و ستم اُن کے
اَب سیکھ لئے میں نے آدابِ شکیبائی

ہر گام نئے رہزن بُنتے ہیں نیا خطرہ
سمجھا نہ سحرؔ پھر بھی سودائی ہے سودائی

اکرم سحر فارانی

دل میں پہلی سی نراس اَب نہ سہی ہے تو سہی
میری طرح وہ اُداس اَب نہ سہی ہے تو سہی

میری اُمیدوں کی کھیتی خُشک ہے بنجر نہیں
اِس میں پہلی سی کپاس اَب نہ سہی ہے تو سہی

جس کی منزل تھی وفا کے میٹھے چشمے کی تلاش
میری آنکھوں میں وہ پیاس اَب نہ سہی ہے تو سہی

پیار کے دو بول میٹھے بن گئے تسکینِ جاں
اِن میں پہلی سی مٹھاس اَب نہ سہی ہے تو سہی

چوم کر خط کیوں میں آنکھوں سے لگانا چھوڑ دوں
اِس میں پہلی سی سپاس اَب نہ سہی ہے تو سہی

اَب ہیں تصویرِ گلیمر بیٹیاں اِس دور کی
جسم پر پورا لباس اَب نہ سہی ہے تو سہی

جس کے آنے سے مہکتا تھا مشامِ جاں سحرؔ
گُل کے دامن میں وہ باس اَب نہ سہی ہے تو سہی

غزلیں

اِتنی چُپ ہے کہ پَرندوں کا جگر بیٹھتا ہے
چَل وہیں بیٹھیں جہاں بوڑھا شجر بیٹھتا ہے

جب تھکن پاؤں کو زنجیر کرے عجلت میں
بیٹھ جاؤں تو وہ کہتا ہے، کِدھر بیٹھتا ہے

گردشِ وَقت عجب موڑ پہ لائی ہے مجھے
گرتی دیوار سنبھالوں گا تو دَر بیٹھتا ہے

خاک پر بیٹھے مجھے قیس نے دیکھا تو کہا
بیٹھ مَسند پہ مِرے دوست، کِدھر بیٹھتا ہے

تو اَندھیرے کے تیقن سے خبردار نہیں؟
کیوں چراغوں پہ چھلے ہونٹوں کو دَھر بیٹھتا ہے

ہر کوئی لائقِ مسند بھی نہیں ہوتا یہاں
ہر کسی کا نہیں دستار میں سَر بیٹھتا ہے

میں جہاں بیٹھتا ہوں ساتھ بٹھاتا ہوں اُسے
اور وہ کم ظرف مِرے سَر پہ مگر بیٹھتا ہے

گرنا پڑتا ہے کئی بار دَرونِ پرواز
پھر کہیں جا کے پرندوں کا یہ پَر بیٹھتا ہے

جس کو معلوم ہوں درویش کی محفل کے اُصول
حَسبِ اوقات وہ چُپ چاپ اُدھر بیٹھتا ہے

اِک لحد میں نے بنائی ہے بدن میں دانش
میرا ہم زاد وہاں شام و سحر بیٹھتا ہے

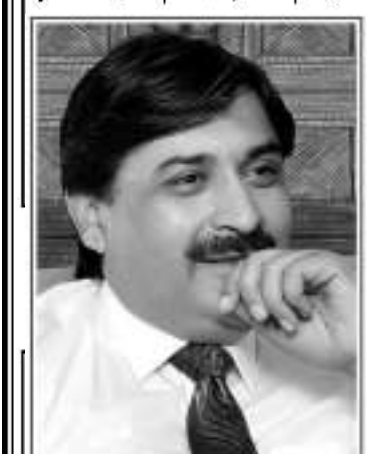

دانش عزیز

بیٹھتا ہوں میں اِدھر سایہ اُدھر بیٹھتا ہے
جیسے آسیب سرِ راہ گزر بیٹھتا ہے

ایسے لوگوں کو نگلتا ہے اندھیرا شب کا
جن کے اذہان میں اک صبح کا ڈر بیٹھتا ہے

یہ منڈیروں کی کسک سہہ نہیں پاتے شاید
یونہی گرتی نہیں دیوار نہ در بیٹھتا ہے

جب تلک پیاس کو ساحل پہ نہ دفنائے کوئی
کون کہتا ہے کہ دریاؤں کا شَر بیٹھتا ہے

جس کو وحشت کا مَرض گھیر لے وہ شخص کبھی
ایک پل چین سے کب اَپنے بھی گھر بیٹھتا ہے

سرنگوں شاخیں اداسی کا فسوں جھاڑتی ہیں
ہجر صدمات سے جب کوئی شجر بیٹھتا ہے

کیسے ہندہ نے چبایا تھا کلیجہ، دانش
سوچنے بیٹھتا ہوں میں تو جگر بیٹھتا ہے

غزل

دل اُچھلتا ہے لگاتار جگر بیٹھتا ہے
جب کوئی پوچھے کہ، تُو کون، کِدھر بیٹھتا ہے

عُمر بھر حسرتِ پرواز ہی رہتی ہے انہیں
جن پرندوں کے بھی اذہان میں ڈر بیٹھتا ہے

شاہ زادوں سے یہ پوچھو! کہ وہ بیٹھیں گے کہاں؟
مجھ سا درویش سَرِ راہ گُزر بیٹھتا ہے

مجھ کو جنّت نظر آتی ہے یہ دوزخ دُنیا
جب کبھی دِل میں محبت کا اثر بیٹھتا ہے

اُس کے پہلو میں ہمیشہ مجھے مِلتی ہے جگہ
جِس کے پیروں میں پہنچنے کا ہُنر بیٹھتا ہے

اپنے چَوگِردگی سے مجھے اندازہ ہوا
میرے پہلو میں کوئی دیدہ وَر بیٹھتا ہے

آؤ کچھ دیر اُسی ندی کے کِنارے بیٹھیں
جِس کی آغوش میں راتوں کو قمر بیٹھتا ہے

صبح تو ساتھ بھگاتی ہے ترے دانش کو
رات ڈھلنے پہ مسافر کا سفر بیٹھتا ہے

وہ کِسی اور کی دہلیز پہ پھر بیٹھا نہیں
جو ترے پاس کبھی ثانیہ بھر بیٹھتا ہے

یونہی خوشبو سے مُعطر یہ گلی کوچے نہیں
تیرا دیوانہ یہاں شام و سَحر بیٹھتا ہے

دانش عزیز

غزلیں

زمین پھولے پھلے، آسماں پھلے پھولے
مری دعا ہے کہ سارا جہاں پھلے پھولے

شگفتگی کے ہزاروں مقام ہوتے ہیں
کسی کو کیا پتہ ہم تم کہاں پھلے پھولے

جڑیں زمین میں، شاخیں فلک میں پھیل گئیں
ہم اس قدر سرِ کون و مکاں پھلے پھولے

وطن سے بڑھ کے یہاں حکمراں ہوئے خوشحال
چمن سے بڑھ کے یہاں باغباں پھلے پھولے

اُگے تھے ایک سی آب و ہوا میں ہم شاہد
پر ایک طرح نہ سارے یہاں پھلے پھولے

شاہد ماکلی

آگ کا تو ادب وہ کرے، جو وفادارِ زرتشت ہے
میں پجاری نہیں، میری آتش کدے کی طرف پُشت ہے

دیکھنا چاہتا ہے ستارہ مرا؟ آ دکھاؤں تجھے
وہ رہا اس طرف! جس طرف کو شہادت کی انگشت ہے

آگ دینی ہے کچھ خواہشوں کو، زیادہ نہیں چاہئیں
ایک دو ہی شرر کافی ہوں گے، خس و خار یک مُشت ہے

لو معافی کا دن آ گیا، آج سب لوگ آزاد ہیں
سارے مفتوح دلشاد ہیں، فتح بے خون و بے کُشت ہے

کل کا کس کو پتہ، آج تک تو مجسم نہیں ہو سکی
ایک خوشبو کی تجسیم کرتے ہوئے ساتویں پُشت ہے

غزل

آ ہی گیا جو کوئی شخص اصل سوال کی طرف
جانا پڑے گا پھر ہمیں تیری مثال کی طرف

اس نے جو پوچھا راستہ چلنے لگی ہوائے سرد
اُٹھی کی اُٹھی رہ گئی انگلی شمال کی طرف

کوششیں کیں بہت کہ وہ چھوڑ دے یہ نشہ مگر
خادرِ عمر جھک گیا خوئے زوال کی طرف

ہائے یہ خوش گمانیاں وائے یہ بد گمانیاں
چشم جمال کی طرف دل مہ و سال کی طرف

دیکھتے دیکھتے اُسے کس طرف آ گیا ہوں میں
ایسا جمالِ بے بہا ایسی کمال کی طرف

تھک سے گئے ہیں ہم سحرؔ شعر میں قیل و قال سے
جانا پڑے گا اب کسی صاحبِ حال کی طرف

حسنین سحرؔ

غزل

ایک پل بھی مجھے آرام نہ کرنے دیں گے
مرے حالات کہاں مجھ کو سنورنے دیں گے

باتوں باتوں میں تری یاد دلا دیتے ہیں
شہر کے لوگ مرے زخم نہ بھرنے دیں گے

مجھ کو جلدی سے تہہِ خاک دبا آئے ہیں
میں تو خوش تھا کہ مجھے دوست نہ مرنے دیں گے

ان کا بھی ہاتھ ہے اس تیز ہوا میں شامل
وہ جو کہتے تھے کہ تجھ کو نہ بکھرنے دیں گے

دل کی مسند سے وہی تو ہیں گرانے والے
مجھ کو کہتے تھے جو دل سے نہ اترنے دیں گے

میں جو بولوں، ترے لہجے میں وہ بولے مجھ سے
لوگ تصویر میں وہ رنگ نہ بھرنے دیں گے

اشرف کمال

غزل

یہ کیسی سرسوں کی مانند پھر سے پیلی ہوئی
تو کیا گرفت تری زندگی پہ ڈھیلی ہوئی

بدل رہی ہے کئی رنگ آسمان کی چھت
سفید ، سرمئی ، پیلی کبھی یہ نیلی ہوئی

مرے مکاں کے برابر مکان کی دیوار
ہوئی جو نم تو اِدھر اینٹ اینٹ گیلی ہوئی

سڑک پہ دیکھا ہے اک حادثے کو ہوتے ہوئے
کہیں کہیں سے مری جلد بھی ہے چھیلی ہوئی

کوئی تو رنج تھا دل میں کہیں چھپایا ہوا
ذرا سی بات بھی ماچس کی ایک تیلی ہوئی

زمانہ رونے سے کرنے لگا اسے موسوم
زمینِ چشم اگر بھول کر بھی گیلی ہوئی

رخشندہ نوید

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

لڑکھڑا کر دم نہ دے دیں ڈگمگاتی دوریاں
دل میں بجھتی لو کی صورت کپکپاتی دوریاں

غزل

کمالِ ضبط کے گیسو اگر بکھر جائیں
پھر اس کے بعد بتاؤ کہ ہم کدھر جائیں

وصالِ یار کا لمحہ ملے، سنور جائیں
تمام وسوسے سینے میں گھٹ کے مر جائیں

نہیں تمھاری طرح ہم جہاں سے ڈر جائیں
کہ ہم سے جو بھی کہے دل، وہ کام کر جائیں

کہاں سے مرہمِ زخمِ جگر، تلاش کریں
تلاشِ چارہ گراں کچھ بتا، کدھر جائیں؟

بجا ہے وعدۂ فردا مگر یہ ڈر ہے مجھے
کہ تب نہ سانس کے موتی مرے بکھر جائیں

تلاش صدیوں سے دل کو بس اک نگر کی ہے
کوئی جو راہ بتا دے تو ہم بھی گھر جائیں

ہوائیں نوحہ کناں، اشکبار ہیں ایسے
کہ جیسے تیری طلب میں نگر نگر جائیں

لپیٹ لیتا ہے مجھ کو غبارِ وہم و گماں
یقین و بیم کے جب قافلے گزر جائیں

ارادہ لاکھ سہی اپنا لوٹ جانے کا
کسی کے کہنے پہ ممکن ہے ہم ٹھہر جائیں

خالدہ انور

غزل

بدن مسمار ہوتا جا رہا ہے
بہت بیزار ہوتا جا رہا ہے

بنی آدم مصیبت میں گھرا ہے
بہت لاچار ہوتا جا رہا ہے

یہ کیسا دور ہے ہر ماں کا بچہ
سمندر پار ہوتا جا رہا ہے

الٰہی تو نے یہ کیا دن دکھایا
وہ خوش اطوار ہوتا جا رہا ہے

بُری خبریں خدارا روک دیجیے
جہاں بیمار ہوتا جا رہا ہے

چنریا اوڑھ لی ہے لال میں نے
کسی سے پیار ہوتا جا رہا ہے

نیلم احمد بشیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

زندگی میں کسی رُخ کا، کسی دُکھ کا ہونا
اچھا ہوتا ہے سفر میں کوئی اپنا ہونا

غزل

آنکھوں کو چاہے کوئی بھی منظر دکھائی دے
بس ایک شخص اس میں برابر دکھائی دے

وہ ساتھ ہو تو ذرے ستاروں سے کم نہیں
اس کے بغیر چاند بھی پتھر دکھائی دے

اس کو بھلانا اب مرے بس میں نہیں رہا
گھر کی ہر ایک چیز کے اندر دکھائی دے

آنکھوں میں آنسوؤں کو لئے پھر رہے ہیں لوگ
میں جس طرف بھی جاؤں سمندر دکھائی دے

روزِ ازل سے جس کا مجھے انتظار ہے
اس سے کہو کہ اب مجھے پل بھر دکھائی دے

وہ افتخار مجھ سے کرے جتنی بے رخی
اتنا حسین پہلے سے بڑھ کر دکھائی دے

افتخار شوکت

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کون دیوان خالد پڑھے گا یہاں
ہم نوا کیا، کہ اب ہم زباں بھی نہیں

غزل

آدمی سے نہ آدمیت سے
خوف آتا ہے تو رعونت سے

تو نے فرعونیت کہاں سے لی
اور لی ہے تو کتنی قیمت سے

اب مجھے ہجر راس آیا ہے
شعر کہتا ہوں اب سہولت سے

خود کشی تو حرام ہوتی ہے
باز آیا ہوں مَیں محبت سے

ایک ایڑی پہ گھومنے کا سفر
میں نے کاٹا ہے کس اذیّت سے

بعد اک عمر کے ملا خود سے
خود کو دیکھا ہے تیری صورت سے

میر و غالب بھی کہہ گئے اصغر
اک قیامت ہے اس کی قامت سے

اصغر علی بلوچ

غزلیں

کچھ سُنے بغیر ہی فیصلہ سنا دیا
منصفی کے نام پر داغ بھی لگا دیا

رات کی سیاہی میں بے ضمیر شخص نے
بے نظیر آدمی راہ سے ہٹا دیا

تیز اِس قدر چلیں آندھیاں دیار میں
قیمتی چراغ بھی ہاتھ سے گنوا دیا

راہ میں لُٹی پُٹی بدنصیب قوم کو
ایک بار پھر کسی غار میں گرا دیا

بولنا تو دور کی بات ہے میاں یہاں
سوچنا بھی جرم ہے یہ اُسے بتا دیا

سرفروش قافلے اب رہیں رواں دواں
خون کی لکیر سے راستہ بنا دیا

مرزا سکندر بیگ

بولتا کیا میں زمانے کا رویہ دیکھ کر
رو دیا اپنی ہتھیلی پر نتیجہ دیکھ کر

چل دیئے چپ چاپ کتنا غم اٹھائے شہر سے
خاک پر گرتے مکانوں کو شکستہ دیکھ کر

آدمی تو آدمی تھے آسماں بھی رو پڑا
آگ میں جلتے ہوئے اپنا اثاثہ دیکھ کر

اک انوکھا کھیل ہے بازی گروں کا زندگی
مسکرا دیتا ہوں اکثر میں تماشہ دیکھ کر

کون صناعیء قدرت کا یہاں قائل نہیں
صاحبِ ایماں ہوئی دنیا کرشمہ دیکھ کر

غزل

تڑپ، چاہت، لگن، دُھن اور جذبہ ہم بھی رکھتے ہیں
ستارے توڑ لانے کی تمنا ہم بھی رکھتے ہیں

ترے الطاف کی امید مولا ہم بھی رکھتے ہیں
کہ پیشانی پہ نورِ نقشِ سجدہ ہم بھی رکھتے ہیں

تمہاری نرگسی آنکھوں کو دیکھا تو ہُوا ظاہر
کہ دل ہی دل میں شغلِ جام و مینا ہم بھی رکھتے ہیں

ہوئے تم غاصبِ آب اور ہم ہیں پیاس کے عامر
بہ قدرِ مشترک دریا سے رشتہ ہم بھی رکھتے ہیں

فقط اپنے تبسم سے ذرا سا حوصلہ دیدو
تمہیں اک بار چھونے کی تمنا ہم بھی رکھتے ہیں

غموں کی دھوپ اگرچہ ہے بہت ہی سخت و جاں لیوا
تو سر پہ سائباں ماں کی دعا کا ہم بھی رکھتے ہیں

فقط تم ہی نہیں گلشن کے تنہا وارث و مالک
چمن کے ایک ایک پتے پہ دعویٰ ہم بھی رکھتے ہیں

ہمیں بھی اے خدا اک چاہنے والا عطا کر دے
کسی سے پیار کرنے کا ارادہ ہم بھی رکھتے ہیں

ذکی طارق

غزل

قلم کی آنکھ نم ہے ، میں نہیں ہوں
جبیں کاغذ کی خم ہے ، میں نہیں ہوں

وہی ہے ، بس وہی ہے ، بس وہی ہے
مجھے اُس کی قسم ہے ، میں نہیں ہوں

کروں کیسے یقیں وہمی انا پر
نوشتے میں رقم ہے ، میں نہیں ہوں

دلِ خستہ کی ہر دھڑکن کا پیہم
وظیفہ دم بہ دم ہے ، میں نہیں ہوں

مری مقدار کیا ، معیار کیا ہے
اُسی کا کیف و کم ہے ، میں نہیں ہوں

متاعِ ہستیٔ موہوم ، توبہ!
گمانِ بیش و کم ہے ، میں نہیں ہوں

مرا ہونا ، نہ ہونا ہے مساوی
یہ ہستی بھی عدم ہے ، میں نہیں ہوں

ذرا سی بھی ہوئی جو لب کشائی
وہیں پر سر قلم ہے ، میں نہیں ہوں

کشاکش کی نہیں ہے تاب مجھ میں
نگوں اپنا علم ہے ، میں نہیں ہوں

مرا ہونا ہی جب ثابت نہیں ہے
تو پھر کیا رنج و غم ہے ، میں نہیں ہوں

اُسی کے راستے ، منزل اُسی کی
اُسی کا دم قدم ہے ، میں نہیں ہوں

یہ ''لاموجودَ اِلّا ہُو'' کا نغمہ
اساسِ زیر و بم ہے ، میں نہیں ہوں

اذانِ فجر کا فیضانؔ لمحہ
گواہی کو بہم ہے ، میں نہیں ہوں

فیض رسول فیضان

غزل

دلِ ویران کی وحشت سے جب گھر چیخ اُٹھتا ہے
تو ایسے میں کوئی میرے برابر چیخ اُٹھتا ہے

کبھی تو ہجر میں تیرے بہت خاموش رہتا ہے
کبھی تیرا یہ آوارہ سخن ور چیخ اُٹھتا ہے

میں کب تک جبر کے عالم میں اپنے لب سیے رکھتا
مسلسل ٹھوکریں کھا کر تو پتھر چیخ اُٹھتا ہے

شکستہ خواب آنکھوں میں لئے جب رات سوتا ہوں
تو کوئی میرے جسم و جاں کے اندر چیخ اُٹھتا ہے

یہاں ہر ظلم پر چُپ چاپ رہنے کی روایت ہے
مگر اِک ناسمجھ ایسا ہے اکثر چیخ اُٹھتا ہے

یہ منظر ہم نے دیکھا ہے کسی کی ناؤ جب ڈوبے
ہوائیں بین کرتی ہیں، سمندر چیخ اُٹھتا ہے

ظہور اِک گھر یہاں ایسا ہے جس میں شام ہوتے ہی
در و دیوار سے سایا لپٹ کر چیخ اُٹھتا ہے

ظہور چوہان

غزل

چراغِ آرزو بھی اپنے جلنے کی جزا مانگے
حدودِ آسماں سے ماورا کوئی فضا مانگے

نکل آئے یزیدی فکر کے پَر پست ذہنوں میں
فُراتِ قلب و جاں پھر اب فضائے کربلا مانگے

وطن کو لوٹ کر اکثر دیارِ غیر جا پہنچے
کوئی تو ہو مرے پیارے وطن کا جو بھلا مانگے

ہمیں تقسیم کر ڈالا ہے یوں اپنے بزرگوں نے
عبادت کو ہر اک اپنے لیے معبد جُدا مانگے

اندھیرے ہر طرف بانٹے نئی رت کے چراغوں نے
بھلا اب کس سے کوئی تیرہ راہوں میں دیا مانگے

پھٹے کاغذ سے اب تو اڑ گئی ہے روشنائی بھی
تمھارا آخری خط مجھ سے تجدیدِ وفا مانگے

روا جب ہر غمِ دنیا کی تُو ہے سارے عالم میں
تو پھر تو ہی بتا تیرے سوا فرحان کیا مانگے

سرور فرحان

غزل

ایک اندھے سفر میں ہوں تنہا
میں تو سب کی نظر میں ہوں تنہا

کتنی رونق ہے تیری دنیا میں
اور میں اِس نگر میں ہوں تنہا

اک پرندہ ہوں چہچہاتا ہُوا
ہاں مگر میں شجر میں ہوں تنہا

لے کے چل تُو مجھے کنارے پر
کشتیٔ جاں! بھنور میں ہوں تنہا

زندگی بھی جوار بھاٹا ہے
زیر میں اور زبر میں ہوں تنہا

بھیگتی شام میں اکیلا ہوں
اور نمودِ سحر میں ہوں تنہا

وسیم جبران

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کوئی پوچھے تو کہیں غیر تھا یا اپنا تھا
ایک چہرے کے سوا شہر میں کیا اپنا تھا

غزلیں

ٹھہرنے کو تو بس یونہی یہاں وہ لمحہ بھر ٹھہرا
مگر پھر وہ مرے دل میں بنا کر اپنا گھر ٹھہرا

انوکھی بات دیکھی ہے یہ میں نے تیری محفل میں
جو جتنا بے وفا نکلا ، وہ اُتنا معتبر ٹھہرا

وہ کیسے کر سکے بِک کر بسیرا پھر کسی دل میں
کہ جس پنچھی کی قسمت میں ہو روز و شب سفر ٹھہرا

زمانے بھر کے اخباروں میں قصّے چھپ گئے تیرے
مگر اِک تُو ہی ہے ایسا ہے جو ان سے بے خبر ٹھہرا

تمھیں کچھ یاد تو ہوگا کہ بچھڑے تھے کبھی ہم تم
وہی اِک خوف تھا دل میں جو میرے عمر بھر ٹھہرا

تھا آنسو بھی تذبذب میں، ٹھہر جائے کہ بہہ نکلے
اُمڈ تو آیا تھا آنکھوں میں پلکوں پر مگر ٹھہرا

گزرتا آیا تیزی سے بڑے سرسبز باغوں سے
پرندہ زندگی کا ایک سُوکھی شاخ پر ٹھہرا

وہ جس کے آنے کی مانگی دعائیں عمر بھر میں نے
وہ آیا بھی مگر گھر پر نہ میرے رات بھر ٹھہرا

ضیا! اب ہم جہاں ٹھہرے، وہاں دائم ہی ٹھہریں گے
یہاں جیون ہمارا تو مسلسل اِک سفر ٹھہرا

سید ضیا حسین

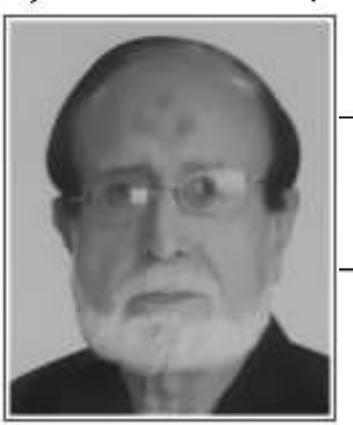

جب بھی دیکھی، تری تصویر پرانی دیکھی
اس بڑھاپے میں بھی ہم نے تو جوانی دیکھی

وہ کسی اور ہی دنیا میں رہا کرتے ہیں
عشق والوں کی یہی خاص نشانی دیکھی

تیرے اندازِ تکلم کے سبھی ہیں عاشق
ایک دنیا ترے لہجے کی دوانی دیکھی

تیرے آنے سے ہوئی رات بھی میری جگ مگ
بعد مدّت کے شبِ تار سہانی دیکھی

یاد آیا ہے مجھے ایک پرانا منظر
جب کبھی میں نے کوئی نقلِ مکانی دیکھی

وہ جو خاموش ہی رہتا تھا لگن میں پانی
اُس کو چھیڑا تو عجب شعلہ بیانی دیکھی

تیری شفاف نگاہی کا اثر ہے یہ بھی
تیرے شعروں میں ضیاؔ! خوب روانی دیکھی

غزل

محبت میں خسارا ہم نہ دیکھیں
کہ آئینہ دوبارا ہم نہ دیکھیں

تمھیں بس اک نظر ہی دیکھنا ہے
بھلے پھر یہ نظارا ہم نہ دیکھیں

گلی سے لوٹتی چپ چاپ نظریں
اداسی کا نظارا ہم نہ دیکھیں

الگ ہو راستہ دل سے ثمینہ
تو قدرت کا اشارا ہم نہ دیکھیں

کہیں ٹوٹے کھلونے، روتے بچے
کہیں اڑتا غبارا ہم نہ دیکھیں

بھنور سے مل کے لڑنا ٹھیک لیکن
کنارے پر کنارا ہم نہ دیکھیں

یہ فصلِ خواب ، امیدوں کی کھیتی
کہیں اڑتا شرارہ ہم نہ دیکھیں

جدائی کی کوئی صورت نہ آئے
سو کرکے استخارہ ہم نہ دیکھیں

کبھی کھولیں نصابوں کی کتابیں
کوئی بھی خط تمھارا ہم نہ دیکھیں

ثمینہ سیّد

غزلیں

ہم ایسے لوگ گردِ سفر ہو گئے تو پھر!
سونے محبتوں کے نگر ہو گئے تو پھر!

صف بندیاں نئی ہمیں درکار تو نہیں
جو دوست ہیں اِدھر کے اُدھر ہو گئے تو پھر!

راہِ فنا پہ بھیجنے والے قیاس کر
ہم خاک ہو کے برگ و ثمر ہو گئے تو پھر!

اندھی بصیرتوں سے ابھی آس ہے بندھی
منظور سب کو کور نظر ہو گئے تو پھر!

جاذب حصار پیار کا بے حد عزیز ہے
دیوار بننے والے ہی در ہو گئے تو پھر!

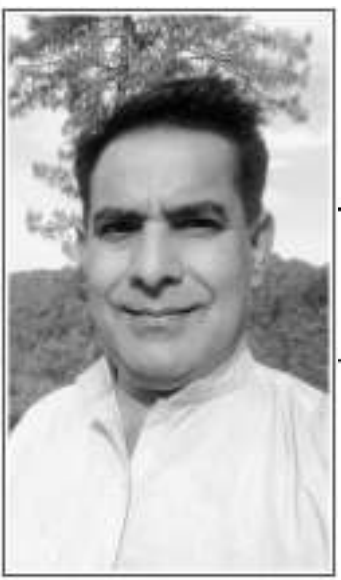

اکرم جاذب

مہک پکار رہی ہے اداس پھولوں کو
جدائی آئے گی کس طرح راس پھولوں کو
ارادتاً ہوئی کوشش یہ پیش قدمی کی
کہ کوئی بھول گیا میرے پاس پھولوں کو
یہ گل فروش دنوں میں امیر ہو جائیں
کرے وہ دان جو اترن کی باس پھولوں کو
نکھار آنے لگا ہے بہار سے پہلے
لگی ہے آپ کے آنے کی آس پھولوں کو
کسی نے آئنہ رو پیرہن اتارا ہے
بنا لیا گیا جیسے لباس پھولوں کو
یونہی تو رنگ پریدہ نہیں ہر اک پتی
تمہاری دید کی لگتی ہے پیاس پھولوں کو
کھلو، ہنسو، کوئی شوخی کرو، ذرا جھومو
کہ زیب دیتا نہیں رنگِ یاس پھولوں کو
نگاہ چہرے سے ہٹتی تو دیکھتا جاذب
لیے کھڑا ہے کوئی میرے پاس پھولوں کو

غزل

زندگی یوں بسر ہوئی تیرے خیال کے بغیر
دامنِ گُل ہو جس طرح کسبِ کمال کے بغیر

ایک عجیب شخص تھا کتنا عجیب شخص تھا
جب بھی ملا، ملا مجھے پُرسشِ حال کے بغیر

جنبشِ لب اگر نہ ہو اور نہ زباں بھی ساتھ دے
ایسے جواب مانگتا تجھ سے سوال کے بغیر

آج نہیں تو کل سہی، کل کا بھی کب یقین ہے
نکلا ہے کوئی دن بھلا اپنے زوال کے بغیر

بعض دفعہ تو یوں ہوا پیار کی گفتگو میں بھی
بات سمجھ نہ آ سکی قولِ محال کے بغیر

بکھرا ہوا ہے چار سُو قریہ بہ قریہ کُو بہ کُو
حُسن عیاں نہ ہو سکا تیری مثال کے بغیر

ہونے لگی ہے منجمد قریہ و کُو میں زندگی
دشت بھی بے رمیدہ ہیں اپنے غزال کے بغیر

آئینہء نگاہ سے مجھ پہ عیاں ہوا نبیل
ہجر تمام بے بسی عکسِ وصال کے بغیر

نبیل احمد نبیل

غزل

تجھے کیوں لگا ہے کہ تشنگی کو مٹا رہی ہیں یہ بارشیں
مرے صحنِ دل کو برس برس کے جلا رہی ہیں یہ بارشیں

ابھی کچھ ہی پل میں شرر بنے گی یہ بوند ہاتھ پہ دیکھنا
ابھی دشتِ جاں کی تمازتوں کو بڑھا رہی ہیں یہ بارشیں

کسی بھٹکتی ہوئی شبِ دِلوں کے جو سُر ملے تھے سرُود سے
وہی گیت من کے گلی گلی میں سُنا رہی ہیں یہ بارشیں

مجھے آ گہی ہے کہ کس جگہ سے ہے ابرِ تر کا یہ سلسلہ
پسِ چھب کہاں سے دھواں اُٹھا ہے بتا رہی ہیں یہ بارشیں

یہ جو ضبط وبط کے ہیں مشورے کسی اور دن پہ اُٹھا کے رکھ
ابھی آرزو بھرے گُل بدن میں کھلا رہی ہیں یہ بارشیں

کہیں یہ نہ ہو کہ فصیلِ جاں تجھے منہدم ملے ایک دن
سرِ چشمِ تر مرے وسوسوں کو بڑھا رہی ہیں یہ بارشیں

عاطف جاوید عاطف

غزل

دل میں ہو چور تو سچائی سے ڈر لگتا ہے
گھپ اندھیرا ہو تو بینائی سے ڈر لگتا ہے

عشق کرنے میں کوئی عار نہیں ہے لیکن
ہاں مگر عشق میں رسوائی سے ڈر لگتا ہے

مجھ کو تنہائی میں ملتا ہے سکونِ خاطر
یوں بھی ہوتا ہے کہ تنہائی سے ڈر لگتا ہے

خون کی خون سے پہچان مٹی ہے جب سے
دشمنِ جاں کی طرح بھائی سے ڈر لگتا ہے

جس کے ہر گوشے میں ہے ایک سمندر پنہاں
مجھ کو اس آنکھ کی گہرائی سے ڈر لگتا ہے

عشق کو کھیل سمجھتے ہیں زمانے والے
مجھ کو اس دشت کی پہنائی سے ڈر لگتا ہے

باغباں توڑ نہ لے شاخِ شجر سے دانش
اس لیے پھول کو رعنائی سے ڈر لگتا ہے

اعجاز دانش

غزل

اک نظر جب مہرباں ہونے لگی
زندگی ، آرام جاں ہونے لگی

موسمِ گل راہ میں ہے اور یاں
آرزوئے دل جواں ہونے لگی

مثلِ صحرا ہر چمن ہونے لگا
ہر حقیقت ، داستاں ہونے لگی

بزمِ مستاں پر ہوا طاری سکوت
صبح دم ، جیسے اذاں ہونے لگی

نام کیا آیا زباں پر عشق کا
ساری دنیا ، نکتہ داں ہونے لگی

جب دلائل ، مسترد اپنے ہوئے
خامشی پھر ترجماں ہونے لگی

بات دل کی، دل میں تھی شوکتؔ ، مگر
چشمِ پرنم سے عیاں ہونے لگی

شوکت محمود شوکت

غزل

شعور و آگہی سے ڈر رہے ہیں
اندھیرے روشنی سے ڈر رہے ہیں

جو اب یونہی گذرتی جا رہی ہے
ہم ایسی زندگی سے ڈر رہے ہیں

ہمارے شہر کے سب حسن والے
تمہاری سادگی سے ڈر رہے ہیں

نکلتے ہی نہیں گھر سے اکیلے
میرے بچے کسی سے ڈر رہے ہیں

کوئی موسم ثمر آور نہیں ہے
شجر کی بے بسی سے ڈر رہے ہیں

کوئی حالت بھی انجانی نہیں ہے
بس اک تیری کمی سے ڈر رہے ہیں

وصال یار کا پھر سامنا ہے
پھر اپنی بے کلی سے ڈر رہے ہیں

جو بحرِ ہجر میں اترے ہوئے تھے
وہ آنکھوں کی نمی سے ڈر رہے ہیں

جو ڈرتے تھے کبھی اپنے کہے سے
وہ اب اک ان کہی سے ڈر رہے ہیں

عجب حالت ہے کچھ دن سے ہماری
ہم اپنے آپ ہی سے ڈر رہے ہیں

یہاں تو سب کا سب اچھا ہے عاصمؔ
ہم ایسی دلکشی سے ڈر رہے ہیں

عاصم اعجاز

غزل

روبرو آ کے مجھے شکل دکھا دی اس نے
لامکانی کے سفر کی یہ سزا دی اس نے

یہ کوئی طرزِ سیاست تھا کہ یہ حکمت تھی
کسی امید کو توڑا، نہ صدا دی اس نے

میں نے بھی شاخِ تمنا سے وہی پھل توڑا
جب ہوئے خاک تو پھر خاک اڑا دی اس نے

مہرباں وقت بھی تھا وصل کی شب اور وہ بھی
نیند آئی نہیں اور شمع بجھا دی اس نے

ایک منزل کے مسافر تھے وہ بھی اور میں بھی
خواب سب میرے تھے تعبیر بتا دی اس نے

درد سہنے ہی سے ملتا ہے سراغِ منزل
ضبطِ پیہم میں نئی سمت دکھا دی اس نے

اس سے تھے دور تو نزدیک ہوئے اللہ کے
ہجر کی شب نئی اک جوت جگا دی اس نے

اس مصور کی طرفداریاں مت پوچھ حبیب
سوچا سمجھا نہیں، تقدیر بنا دی اس نے

بشیر احمد حبیب

غزلیں

کہاں نمائشِ جذبات کرنا چاہتے ہیں
تجھے تو واقفِ حالات کرنا چاہتے ہیں

روا رکھا ہے جو تو نے تمام لوگوں سے
وہی سلوک ترے سات کرنا چاہتے ہیں

انہیں یہ چاہیے رکھیں کتاب سے رشتہ
جو سیرِ ارض و سماوات کرنا چاہتے ہیں

جنہیں قبول کریں گے گنے چنے اذہان
رقم کچھ ایسے خیالات کرنا چاہتے ہیں

مکینِ خانہ سادات ہیں بتاؤ انہیں
جو لطف صدقہ و خیرات کرنا چاہتے ہیں

ہمارے باغ میں آنے کا تذکرہ سن کر
تمام پھول ملاقات کرنا چاہتے ہیں

نہیں گنوائیں گے غفلت کی نیند میں واصف
یہ رات وقفِ مناجات کرنا چاہتے ہیں

واصف سجاد

آ دکھ سے سکوں کشید کر لیں
پہلے بھی کیا مزید کر لیں

جذبے ہیں وہی قدیم لیکن
اظہار ذرا جدید کر لیں

چاہت نہیں ممکنات میں گر
نفرت ہی چلو شدید کر لیں

تصویر سے گفتگو ہے اپنی
ہم دید کو بھی شنید کر لیں

چھوڑیں بھی پٹی ہوئی روش کو
کام عقل سے کچھ بعید کر لیں

غزل

جاں میں کوئی اضطراب کب ہے
سب کچھ ہے مگر کتاب کب ہے

یہ وہم بھی اپنے ذہن کا ہے
صحرا میں کوئی سراب کب ہے

ہوتی ہیں یہاں جو منفی باتیں
عادت ہے یہ، انقلاب کب ہے

یہ روتی ہوا بھی ہے حقیقت
وہ جلتا شجر بھی خواب کب ہے

ہر دم جو سکھائے مسکرانا
ایسا بھی کوئی نصاب کب ہے

باقی ہے ابھی تو زہرِ دل میں
بے باک مرا حساب کب ہے

دھکے سے گزرتی زندگی ہے
عالم میں یہ انتخاب کب ہے

کم تر کی مثال دوں تو کیونکر
چہرہ ہے ترا گلاب کب ہے

ہے عشق تو مشغلہ ہمارا
اور حُسن ہمارا خواب کب ہے

ایماں کی جھلک ہو جس میں روشنؔ
اب ایسا کوئی حساب کب ہے

اعجاز روشن

غزل

بے نام سے اِک خوف سے بھر جاتا ہوں اکثر
میں رات کو سوتے ہوئے مر جاتا ہوں اکثر

اُنگلی کو چُھڑا کر میں بچھڑ جاتا ہوں خود سے
گُم کر کے کہیں خود کو، میں گھر جاتا ہوں اکثر

ویسے تو بہادر بھی ہوں، بے خوف و نڈر بھی
سائے سے مگر اپنے ہی ڈر جاتا ہوں اکثر

دیوار سے ڈھلتے ہوئے سایوں کے جلَو میں
یادوں کے جزیرے پہ اُتر جاتا ہوں اکثر

چُپ چاپ نکل جاتا ہوں روز اپنے بدن سے
پوچھو نہ کوئی مجھ سے، کدھر جاتا ہوں اکثر

میرا نہ یقیں کرنا کہ ہوں بھی یا نہیں بھی
میں اپنے ہی ہونے سے مُکر جاتا ہوں اکثر

رکھتی ہے تکبّر سے پرے خاک نشینی
مٹی میں جو ملتا ہوں، سنور جاتا ہوں اکثر

برباد کیا کس نے، یہ معلوم ہے لیکن
الزام کسی اور پہ دھر جاتا ہوں اکثر

جب روشنی بن جاتی ہے اندر کی اُداسی
تطہیر سے باطن کی نِکھر جاتا ہوں اکثر

اشرف نقوی

غزلیں

مجھے ملتے ہیں منظر ہر طرف سے
گذرتا ہوں میں اکثر ہر طرف سے
قدم رکھے ہی تھے میں نے سڑک پر
نکل آئے گداگر ہر طرف سے
مجھے سب کچھ دکھائی دے رہا ہے
بلندی کے سفر پر ہر طرف سے
جہاں میں کوئی بھی اپنا نہیں ہے
لگی ہے مجھ کو ٹھوکر ہر طرف سے
بلاتا ہے مسلسل تشنگی میں
سمندر ہی سمندر ہر طرف سے

محمد نوید مرزا

تم کو دکھ ہے، سفر سفر نہ رہے
مجھ کو ڈر ہے یہ رہگذر نہ رہے
سب کے بدلے ہوئے رویے ہیں
شہر کے لوگ معتبر نہ رہے
اب جدائی کے بعد سوچتے ہیں
کیوں ترے ساتھ عمر بھر نہ رہے
تم کو دستار کی پڑی ہوئی ہے
کیا خبر ہے ، بدن پہ سر نہ رہے
کس طرح وہ شجر شجر گھومیں
جن پرندوں کے بال و پر نہ رہے

یہ دنیا آئنہ خانہ ہے کوئی
جہاں آتے ہیں پتھر ہر طرف سے
خدا جانے کہاں سے آگئے ہیں
مری چھت پر کبوتر ہر طرف سے
یہ دنیا اور یہ کمزور رشتے
مجھے بھی ہیں میسر ہر طرف سے

پانیوں میں ہی بہہ گیا سب کچھ
ایک ریلے کے بعد گھر نہ رہے
تجھ سے کوئی مکالمہ کیا ہو
بات کا جب کوئی اثر نہ رہے
ہجر کی رت میں اتنا رویا ہوں
کیا خبر میری چشم تر نہ رہے

غزل

جنت سے ایک پَل میں نکالا گیا مجھے
پھر حادثوں کی گود میں پالا گیا مجھے

سورج کبھی ملا تو کبھی چاند مل گیا
یوں روشنی کے سنگ اُجالا گیا مجھے

بربادیوں سے مجھ کو لپٹنا عزیز تھا
دنیا کی ٹھوکروں سے سنبھالا گیا مجھے

کالک مرے نصیب کی مٹی میں گھول کر
جلتے بدن کے چاک پہ ڈھالا گیا مجھے

سب ٹاس کر رہے تھے محبت کے کھیل کا
سِکہ بنا بنا کے اُچھالا گیا مجھے

دنیا میں کوئی چیز جو مانگی گئی کبھی
روزِ جزا کے نام پہ ٹالا گیا مجھے

روزِ ازل سے رُوح میری پنجتن کی تھی
سانچے میں اُن کی چاہ کے ڈھالا گیا مجھے

پھیلا نہ اُس کی آنکھ میں کاجل کبھی عقیل
گو غم کی جلتی آگ میں ڈالا گیا مجھے

عقیل رحمانی

غزل

خیالِ یار سے نِکلوں تو کوئی بات کروں
میں اُس کے پیار سے نِکلوں تو کوئی بات کروں

کروں گا میں بھی کوئی بات بے قراری کی
مگر قرار سے نِکلوں تو کوئی بات کروں

ابھی ہے اُس کی محبت کا اِنتظار مجھے
میں اِنتظار سے نِکلوں تو کوئی بات کروں

جو اُس کی یاد کا چھایا ہُوا ہے دِل پہ مرے
میں اس خُمار سے نِکلوں تو کوئی بات کروں

ابھی خزاں کا میں کچھ بھی بتا نہیں سکتا
کبھی بہار سے نِکلوں تو کوئی بات کروں

ابھی تو آنکھوں کے آگے غُبار سا ہے کوئی
میں اِس غُبار سے نِکلوں تو کوئی بات کروں

بڑا ہی جُرم ہے سچ بولنا یہاں کیفی!
میں اِس دیار سے نِکلوں تو کوئی بات کروں

محمود کیفی

غزل

رانا سعید دوشی

رونق آغاز در و بام سے ہو، جتنی ہو
روشنی صبح تلک، شام سے ہو، جتنی ہو

جونؔ تو چیز ہے کیا، میں نہ بنوں غالبؔ بھی
میری پہچان مرے نام سے ہو، جتنی ہو

شعر میں نام و نسب میرا حوالہ نہ بنے
میری توقیر مرے کام سے ہو، جتنی ہو

عشق الزام اگر مجھ پہ کیا ہے عائد
پھر سزا بھی اسی الزام سے ہو، جتنی ہو

تُو بُرا ہے تجھے دل دل میں تو گالی دے لوں
کچھ تشفی مری دشنام سے ہو، جتنی ہو

اس قدر بھی نہ بھروسہ کرو کم ظرفوں پر
کچھ نصیحت مرے انجام سے ہو، جتنی ہو

ڈور سلجھانے کی خاطر بھی سرا ہے درکار
کوئی تفہیم تو ابہام سے ہو، جتنی ہو

مجھ پہ یکدم نہ گرا اتنے مصائب کے پہاڑ
یہ اذیت ذرا آرام سے ہو، جتنی ہو

غزل

بستی بستی شور بپا ہے، جس کی شوخ اداؤں کا
اس کی خاطر ڈھونڈ رہا ہوں، جوتا پتلے پاؤں کا

اِس گاؤں میں بسنے والے، تجھ سے ڈرتے رہتے ہیں
یوں لگتا ہے باپ تمہارا نمبردار ہے گاؤں کا

سوچ رہا ہوں یارم! تیرے ہاتھ میں کیسا دیپک ہے
جس کو خوف نہیں ہے کوئی اتنی تیز ہواؤں کا

ایک اکیلی جان پہ میں نے سارے بوجھ اٹھائے ہیں
ایک اکیلی جان پہ جھیلا، میں نے زور بلاؤں کا

تیرا میرا میل نہ ہوگا، اس دنیا کے میلے میں
میرا کنبہ ریگستانی، تو ماجھی دریاؤں کا

اپنی اور بلاتی ہے آواز مجھے خاموشی کی
لیکن رستا روک رہا ہے اک طوفان صداؤں کا

اک صحرا میں آ کر میں نے، جب سے ڈیرا ڈالا ہے
اپنا سینہ پیٹ رہا ہے، موسم ٹھنڈی چھاؤں کا

انصر کوئی بیٹھ گیا ہے، آ کر اک چوراہے میں
جائے تو کس جانب جائے، بندہ ڈھیر خداؤں کا

انصر حسن

غزل

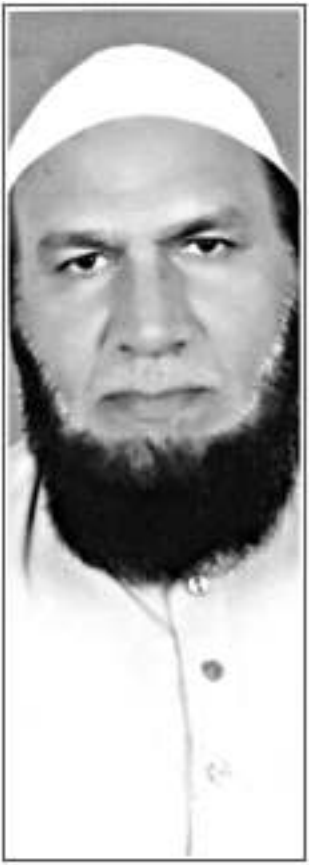

شاید حریمِ قدس کی کوئے جناں کی ہے
چڑھتی ہے آسمان کو مٹی کہاں کی ہے

ٹھنڈی ہوائیں درد کی سوغات لے اڑیں
تاثیر اس قدر مرے اشکِ رواں کی ہے

اس کی محبتوں میں ہوئے معرکے عجب
گویا کہانی جنگ کی تیر و سناں کی ہے

میں حلقۂ غبارِ سفر کا مکیں ہوا
رہزن کو کیوں تلاش مرے آشیاں کی ہے

پھرتے ہیں لے کے آنکھ میں خوابوں کی کھیتیاں
حالت عجیب شہر میں پیر و جواں کی ہے

آخر رضا ہوا ہی کرے گی ہوا اسے
احباب کو جو فکر لحد کے نشاں کی ہے

رضا اللہ حیدر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

شکستگی میں بھی ہم اس کے پاؤں پڑ نہ سکے
کھڑے رہے کسی گرتے ہوئے مکاں کی طرح

غزل

سب دروازے ڈھور کھے ہیں تب ہی دل دیوار ہوا ہے
خشک کنارا کیونکر سمجھے کیسے دریا پار ہوا ہے

عام سی باتیں، عام سے چہرے کیسے یوں دولخت لگے ہیں
صدماتی تخریب کے ہاتھوں غم جل کر انگار ہوا ہے

اجڑے بنجر صحرا میں جب پانی رس کر لہو بنے ہے
خاموشی کا بین ہے پوچھے، کس کے دل پر وار ہوا ہے

سوچ کے فرتے روپ بدل کر رینگنے والے سانپ ہوئے ہیں
چلو بھر کیا پانی پھیلا، ہر رستہ منجدھار ہوا ہے

وقت کا یہ بدلاؤ ہے کیسا، خالی برتن گرہیں کھولیں
سب شہتیر ہیں برف کے تودے، الجھا دھاگا تار ہوا ہے

سعدیہ بشیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

لیے پھرتا تھا جو در در مجھ کو
بھول سکتا ہے وہ کیونکر مجھ کو

غزلیں

یہ جو سپنا ہے مقدر بھی تو بن سکتا ہے
ایک تصویر سے منظر بھی تو بن سکتا ہے
یہ ضروری تو نہیں جاں سے گزر کر پہنچوں
مرا مرقد مرے اندر بھی تو بن سکتا ہے
مرے آنسو کو حقارت کی نظر سے مت دیکھ
یہ جو قطرہ ہے سمندر بھی تو بن سکتا ہے
ایک دنیا دلِ ناشاد میں آباد ہوئی
اتنی تنہائی سے لشکر بھی تو بن سکتا ہے
بن کے پتھر وہ مری راہ میں آ بیٹھا ہے
وہ مرے پاؤں کی ٹھوکر بھی تو بن سکتا ہے

فیصل زمان چشتی

یہ فیصلہ بھی محبت کے ناقدین کا ہے
کہ درمیاں میں تعلق فقط یقین کا ہے
کسی بھی غیر پہ تہمت میں کیوں لگاؤں گا
اس انہدام میں کردار آستین کا ہے
مری وفائیں بھی کیسے تجھے نظر آئیں
تری بھی آنکھ میں سُرمہ مخالفین کا ہے
متاعِ درد سمجھتے ہیں زندگی کا وصول
یہ حوصلہ بھی محبت کے زائرین کا ہے
یہاں چراغ کہ لَو بھی اندھیرا مانگتی ہے
ہمارے شہر پہ قبضہ منافقین کا ہے

کیوں وہ کانٹوں پہ مرا دامنِ خستہ کھینچے
وہ حسیں شاخِ صنوبر بھی تو بن سکتا ہے
جاہ و حشمت پہ ہی موقوف نہیں ہے سب کچھ
دل اَبابیل کا کنکر بھی تو بن سکتا ہے
تم کو جس شخص پہ اتنا ہے بھروسہ فیصلؔ
وقت آنے پہ ستمگر بھی تو بن سکتا ہے

عدو کے ہاتھ میں تلوار دی ہے اپنوں نے
اور اس کے ساتھ جو لشکر ہے حاسدین کا ہے
خلاؤں پر بھی قدم رکھ دیا ہے چاند پہ بھی
یہ شہسوار جو پالا ہوا زمین کا ہے
یہاں پہ آتا ہے فیصلؔ وہ ٹِک نہیں پاتا
دلِ خراب بھی خیمہ مہاجرین کا ہے

غزل

سکھائی جس کو دانائی
ہمیں کہتا ہے سودائی

کسی کا دل بھرا ہم سے
ہماری آنکھ بھر آئی

ہمارے بعد کیا ہو گا
کہاں جائے گی تنہائی

تو کیا یہ زیب دیتا ہے
بتا دیں اس کی زیبائی

سمجھ آئی نہیں دنیا
یہ اب جا کے سمجھ آئی

ابھی لوگوں کو جینے دو
ابھی لینا نہ انگڑائی

نہ وہ اب خواہشیں اپنی
نہ وہ دنیا کی رعنائی

ہم اہلِ دل کی قسمت میں
ہے رسوائی ہی رسوائی

کسے دل کی بتائیں ہم
ہمارا کون ہے بھائی

نہ پوچھو وصل کا ہم سے
اٹھی نظریں نہ بات آئی

کبھی وہ کاش پھر کہہ دے
ذرا ٹھہرو صغیر،..... آئی

صغیر احمد صغیر

غزل

راحتیں ڈھونڈتا ہے دل وہ ہی
الفتیں ڈھونڈتا ہے دل وہ ہی

مل کے رہتی تھی پیار سے دنیا
چاہتیں ڈھونڈتا، ہے دل وہ ہی

لہلہاتی وہ دور، تک فصلیں
وسعتیں ڈھونڈتا ہے دل وہ ہی

بیٹھا دریا، کنارے کرتے تھے
فرصتیں ڈھونڈتا، ہے دل وہ ہی

ڈھانپا کرتی تھیں سر جو عورت کا
چادریں ڈھونڈتا، ہے دل وہ ہی

ڈھانپتی تھیں جو جسم عورت کا
خلعتیں ڈھونڈتا، ہے دل وہ ہی

جلوتوں سے ہیں اتنے، اکتائے
خلوتیں ڈھونڈتا ہے دل وہ ہی

یاد ہے دور اپنے بچپن کا
عادتیں ڈھونڈتا ہے دل وہ ہی

عاصم بخاری

غزل

کہانی کچھ ایسے بنائی گئی ہے
کہ اس میں حقیقت چھپائی گئی ہے

فسانے کا اِس پہ گماں ہو رہا ہے
ہمیں داستاں جو سُنائی گئی ہے

حقیقت کا اِس سے تعلق نہیں ہے
جو تصویر سب کو دکھائی گئی ہے

تمہارے لیے کھیل ہندسے عدد ہیں
مری عمر بھر کی کمائی گئی ہے

ہے اوقاتِ دل کیا بجز قطرۂ خوں
مگر اِس میں دُنیا بسائی گئی ہے

مُجھے ہے محبت زمانے سے بڑھ کر
تُمہارے لیے بس یہ آئی گئی ہے

محبت ملی تو محبت کے بدلے
مری لذتِ آشنائی گئی ہے

راجہ عبدالقیوم

غزل

تیرے جیسے ترے کمال کے دکھ
اِس لیے رکھے ہیں سنبھال کے دکھ

کیا کروں دوسری محبت کا
ماضی جیسے ہیں میرے حال کے دکھ

دس برس میں ہوا تھا پیار مجھے
تیس کا میں ہوں، بیس سال کے دکھ

کر کے دیکھا حساب جیون کا
دکھ ہی دکھ ہیں بچے، نکال کے دکھ

درد مانوس ہو گیا مجھ سے
کھیلتا ہوں تبھی اُچھال کے دکھ

جو بہاروں میں سوکھ جاتی ہے!
میں سمجھتا ہوں ایسی ڈال کے دکھ

آنکھ کے ساتھ دل بھی روتا ہے
سوچ کر حضرتِ بلال کے دکھ

اپنے بچوں سے بڑھ کے پالے ہیں
میں نے اکمل نبیؐ کی آل کے دکھ

اکمل حنیف

غزلیں

اندھیروں کو مٹانے کا ہنر تخلیق کرتا ہوں
میں اپنے ہاتھ سے شب کی سحر تخلیق کرتا ہوں

وہ جس سے آنے والے دور کا ادراک ہو جائے
میں اپنی آنکھ میں ایسی نظر تخلیق کرتا ہوں

تمھاری آرزو جب زندگی کرنا سکھاتی ہے
نئی اس روشنی میں اک ڈگر تخلیق کرتا ہوں

عدو ہر روز نفرت کی نئی دیوار اُٹھاتے ہیں
میں الفت کے ہنر سے اس میں در تخلیق کرتا ہوں

ہمیشہ چاک پر مٹی مجھے تکتی ہے حیرت سے
کہ میں کوزہ نہیں خود کوزہ گر تخلیق کرتا ہوں

مجھے کیا ہے ضرورت قافلہ سالار بننے کی
میں اس سے دو قدم آگے سفر تخلیق کرتا ہوں

وفا اور پیار کی مٹی سے اُٹھا ہے خمیر اپنا
محبت سے محبت کا نگر تخلیق کرتا ہوں

گرا کر دوسروں کو رفعتیں ہرگز نہیں ملتیں
جو ہوں خود سر بلند ایسے میں سر تخلیق کرتا ہوں

محمد افضال انجم

ابھی اس کا مقدر بولتا ہے
جبھی اتنا بگڑ کر بولتا ہے

زبانیں گنگ ہیں سب منصفوں کی
جبھی دستِ ستمگر بولتا ہے

زباں سمجھی نہ جائے بات کی جب
اکیلا پھر وہاں سر بولتا ہے

بلند آہنگ ہے اب اُس کا لہجہ
کوئی تو اُس کے اندر بولتا ہے

ذرا دیوار کی تحریر پڑھ لو
سنو آہٹ تغیر بولتا ہے

چراؤں آنکھ اس لمحے سے کیونکر
نگاہوں میں وہ منظر بولتا ہے

غزلیں

ہر گل پہ تازگی ہے کہ، آئی نکھار رت
ٹھہری ہے گلستان میں، ایسی بہار رت

ہے تتلیوں پہ چھائی یہ، مستی شراب سی
کیسا یہ لے کے آئی ہے، پھر سے خمار رت

ہر پھول کی کلی پہ ہی ہے، ہو رہا فدا
بھنورا منا رہا ہے یہاں، دل بہار رت

پچھلے برس کے پھول سجے ہیں گلاس میں
تنہائیوں کی چھاپ ہے یہ، غم گسار رت

موسم بدل سکا نہ کبھی بھی نصیب کا
چھائی رہی ہے گل پہ، یہی بے قرار رت

کوکی گل

ایک ذرا سی بھول ہوئی تو ہجر کا لمحہ دیکھ لیا
جانے کیسے خوف نے میرے گھر کا رستہ دیکھ لیا

شام ہوئی تو اپنے اپنے گھر کو پنچھی لوٹ آئے
اک تیری ہی خبر نہ آئی میں نے ہر جا دیکھ لیا

خاموشی کا راج ہے ہر سو چھایا اک سناٹا ہے
میں نے اپنے آپ میں کوئی روتا بچہ دیکھ لیا

"مولا سب کی خیر ہو" دن بھر وہ یہ دعائیں کرتی ہے
درد نے شاید میری ماں کے دل کا کعبہ دیکھ لیا

میں نے سوتے جاگتے دیکھا جن کو ایک تسلسل سے
نیند نے میرا خوابوں سے اک انمٹ رشتہ دیکھ لیا

بچپن کی کھوئی یادوں کو ڈھونڈ کے اب لائے گا کون
میں نے اپنی الماری اور سارا بستہ دیکھ لیا

منزہ سحر

غزل

دوستی تم سے دل لگی تم سے
اب تو سجتی ہے زندگی تم سے

تیرگی میں تھی زندگی میری
میں نے پائی ہے روشنی تم سے

نیند آنکھوں میں پھر نہ آئی کبھی
آنکھ جس دن سے ہے لڑی تم سے

ہم زباں سے وہ بات کہہ نہ سکے
بات آنکھوں نے جو کہی تم سے

لب ترے ہیں گلاب، آنکھ کنول
پھول لیتے ہیں نازکی تم سے

یوں تو ہے مطمئن بہت اشفاق
جاں پہ جب بھی بنی ، بنی تم سے

محمد اشفاق بیگ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پیاس بجھا لے پیارے
چلے لہو کے دھارے

غزلیں

بات دستار تک چلی آئی
میرے کردار تک چلی آئی

میں جو رسوائیوں سے ڈرتا تھا
بات اخبار تک چلی آئی

ایک خاکہ سا صرف سوچا تھا
سوچ شہکار تک چلی آئی

ایسا کیا تھا تمھاری آنکھوں میں
بات اظہار تک چلی آئی

اس نے سوچا تھا صرف جانے کا
دھوپ دیوار تک چلی آئی

میں نے تو صرف ہاتھ تھاما تھا
سرخی رخسار تک چلی آئی

ہائے ثقلین وہ ترے پیچھے
گھر سے بازار تک چلی آئی

اس نے اتنا مجھے ستایا ہے
ہجر اشکوں میں ڈھل کے آیا ہے

اس محبت نے تپتے صحرا میں
زندگی بھر مجھے جلایا ہے

خوف کھاتے ہو کس لیے مجھ سے
کیا کسی نے تمھیں ڈرایا ہے

اس نے برباد کر دیا مجھ کو
میں نے چاہت میں سب لٹایا ہے

جس کو پروا نہیں زمانے کی
اس نے دل کو مرے چرایا ہے

بس یہ کافی ہے میرے جینے کو
مجھ پہ دستِ نبیؐ کا سایہ ہے

کل تلک تو وہ مجھ سے نالاں تھا
آج ثقلین کیوں بلایا ہے

ثقلین جعفری

غزل

بجا کہ نقش بنے اور بیشمار بنے
مرے قلم نے بنائے تو شاہ کار بنے

وہ ہونٹ چپ ہوں تو ماحول سوگوار رہے
وہ لب کھلیں تو تبسم کی آبشار بنے

بہت عزیز ہیں اب بھی اسے وہ پھول کہ جو
حنائی ہاتھ کا گجرا ، گلے کا ہار بنے

مرا بھی مشغلہ ہے چوٹیوں کو سر کرنا
خدا کرے وہ بہت جلد کوہ سار بنے

پھر ایک دن وہ دلوں کے شکار پر نکلے
میں انتظار کروں گا وہ شہ سوار بنے

مجھے یہ ضد تھی کہ جذبوں کو احترام ملے
وہ چاہتا تھا محبت بھی کاروبار بنے

یہ کہنہ سالی ، یہ بوسیدگی ، یہ تاج محل
اب اس سے ہٹ کے محبت کی یادگار بنے

گذشتگاں کا نشاں تک نہیں ملے گا تمھیں
یہاں کی مٹی کو مدت ہوئی غبار بنے

رانا غلام محی الدین

غزل

بڑے ہی چاؤ سے ٹہنی سے توڑ لایا ہوا
میں پھول ہوں کسی گل دان میں سجایا ہوا

نہ یاد رکھا ہوا ہوں نہ ہوں بھلایا ہوا
خیال ہوں کسی شاعر کے دل میں آیا ہوا

نیا نویلا سا اک گیت اور اتنا نیا
جسے کسی نے بھی اب تک نہیں ہے گایا ہوا

میں ایک دل ہوں کسی راستے میں گم کردہ
سمجھ کے ایک مقدس ورق اٹھایا ہوا

میں ایک نقش ہوں اور نقش بھی ہوں کچھ ایسا
کہ کچھ بنایا ہوا ہوں تو کچھ مٹایا ہوا

ابھی تو میری حقیقت کوئی معمہ ہے
ابھی میں خاک کے پیکر میں ہوں سمایا ہوا

وہ جانتا ہے کہ میں خود ہی لوٹ آؤں گا
سو بے وجہ نہیں صیاد نے اڑایا ہوا

فسردگی مرے شعروں سے یوں جھلکتی ہے
کہ جیسے آنکھ میں آنسو کوئی چھپایا ہوا

گرے ہوئے کو سنبھلنا بھی آ ہی جاتا ہے
اگر کسی نے نظر سے نہ ہو گرایا ہوا

کبھی کبھی اسے خدشے بھی گھیر لیتے ہیں
قدم قدم پہ جو دل ہو فریب کھایا ہوا

مجھے خدا نہیں لوگوں سے خوف آتا ہے
کہ میں خدا نہیں، لوگوں کا ہوں ڈرایا ہوا

میں مشکلوں میں خصوصاً یہ ورد کرتا ہوں
علی علی کا وظیفہ ہے مجھ کو بھایا ہوا

یہ ٹمٹماتی ہوئی لو مرا ارادہ ہے
کہ راستے میں ہواؤں کے ہوں جلایا ہوا

علمدار حسین

غزل

کام یہ مشکل ہے لیکن پھر بھی کر جاتا ہوں میں
زندگی تیرے لیے جی کر بھی مر جاتا ہوں میں

اس قدر حالات نے مسمار کر ڈالا مجھے
عکس اپنا دیکھ کر شیشے میں ڈر جاتا ہوں میں

منتظر بیٹھا ہوا ہے اب بھی اک ساقی مرا
تم گزارو رات مے خانے میں، گھر جاتا ہوں میں

جب ہوائے تند چلتی ہے سر گلشن کبھی
خشک پتوں کی طرح اے دل بکھر جاتا ہوں میں

کھینچنے لگتی ہے مجھ کو اس کی زلفوں کی مہک
مجھ کو ہوتا ہے کدھر جانا کدھر جاتا ہوں میں

زندگی کس نے چرالی میرے ہونٹوں کی ہنسی
قہقہوں کے شہر سے بھی چشم تر جاتا ہوں میں

اس سے مل کر جب بچھڑنے کی کبھی سوچوں شکیلؔ
اندر اندر ٹوٹ کر یکدم بکھر جاتا ہوں میں

شکیل ارمان

غزل

دل کے آنگن سے ڈر نکالیں گے
رات سے ہم سحر نکالیں گے

چیر کر اس زمیں کی انتڑیاں
شہر لعل و گہر نکالیں گے

آگ سے کھیلنا ہے اپنا کام
رنگ گل سے شرر نکالیں گے

برف پگھلے گی موسم غم کی
ہم بھی پھر بال و پر نکالیں گے

دفن کرنے چلے ہو تہمت گل
لالہ و گل تو سر نکالیں گے

دشت میں بوئیں گے گلاب عشق
حرف اپنا اثر نکالیں گے

اس لیے بات میں نہیں کرتا
عیب اہل ہنر نکالیں گے

شمع روشن کریں گے الفت کی
سوز قلب و جگر نکالیں گے

ہم بھی دیوار ہجر سے مظہر
کھڑکیاں اور در نکالیں گے

مظہر حسین مظہر

غزل

زندگی دل کو میسر ہے خرابے میں بھی
اِک نیا پھول کھلا زرد علاقے میں بھی

آسماں چاند کے چہرے سے ہوا ہے روشن
کتنے خوش باش ستارے ہیں اندھیرے میں بھی

جاگتی آنکھوں میں اب نقش بناتا ہوں میں
خواب تیرے ہی مجھے آتے ہیں سوتے میں بھی

کتنی وحشت ہے یہاں غم کی گذرگاہوں میں
پہلے جیسی کہاں رونق ترے کوچے میں بھی

گدلے پانی کی حکایت سے یہی ثابت ہے
کچھ تحرک یہاں موجود ہے ٹھہرے میں بھی

یہ جو تاثیر کی برکت ہے نمایاں سب پر
جانے کیا خاص ہے اِس رنگ کے رکھے میں بھی

چلتے پھرتے ہوئے گلیوں سے گذرتے امجد
اِک صدا آتی ہے اُٹھتے ہوئے بیٹھے میں بھی

امجد بابر

غزلیں

آنکھیں دھری تھیں طاق پہ جیسے ہوں دو دیئے
چھلکے غمِ جدائی سے ہم اور رو دیئے

منزل بہت قریب تھی پر اب یہ حال ہے
تم سے بچھڑ کے ہم نے تو رستے ہی کھو دیئے

ان کے خطوط ہم نے کئے سب سپردِ آب
خوابوں کے جس قدر تھے سفینے ڈبو دیئے

قائم نہیں رہا تھا بھرم اعتبار کا
جب دوستوں نے پیٹھ میں خنجر چبھو دیئے

پونچھے گا کون آنسو تمہاری طرح مرے
اس بے بسی نے میرے دوپٹے بھگو دیئے

تصویر تیری بنتی ہے کھینچوں کوئی لکیر
باقی نقوش وقت کی بارش نے دھو دیئے

عائشہ ظفر

ہاتھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے ڈر جاتی ہوں
اب نئے دوست بناتے ہوئے ڈر جاتی ہوں

بیتی باتوں کے شرارے نہ بھڑک جائیں کہیں
اس لیے راکھ ہٹاتے ہوئے ڈر جاتی ہوں

شام ہوتے ہی ستاتی ہے مجھے گھر کی کمی
راہ میں شام بتاتے ہوئے ڈر جاتی ہوں

پیڑ کے سائے تلے بیٹھ تو جاتی ہوں مگر
پیڑ کو حال سناتے ہوئے ڈر جاتی ہوں

پھول کے ساتھ ہی کانٹے بھی ہوا کرتے ہیں
پھول جوڑے میں سجاتے ہوئے ڈر جاتی ہوں

وہ تو کہتا ہے سدا میں ہی رہوں گی اس میں
پھر بھی میں گھر کو بناتے ہوئے ڈر جاتی ہوں

ہجر زادوں کو میں دیکھوں تو یہ دل دکھتا ہے
ان کا غم عاشی بٹاتے ہوئے ڈر جاتی ہوں

غزل

اس کو دیکھا گیا حقارت سے
سانپ نکلا تھا جس عمارت سے

عشق سودا ہے ایک گھاٹے کا
کیا کمایا ہے اِس تجارت سے

خط تمہارے لیے وُہ پھرتے ہیں
جتنے محروم ہیں بصارت سے

تم نے بس میم لکھ کے بھیجا ہے
کیا کروں اَخذ اِس عبارت سے

عمر بھر یاد تجھ کو آئے گا
اُس نے چھوڑا ہے اس مہارت سے

جس نے سچ کا علم اٹھایا اسے
ہاتھ دھونے پڑے وزارت سے

جس موسم نے کاٹ کھایا انہیں
جسم پگھلے نہ جو حرارت سے

جن کو خوشیاں نہ راس آئیں کبھی
وہ تو گھبرائیں گے بشارت سے

کتنے لوگوں کا فائدہ ہو گا
چند لفظوں کی اس جسارت سے

وہ کسی کام کا نہیں رہتا
جو بھی دیکھے اسے شرارت سے

آبِ زم زم سے چل نہا عابد
میل اترے گی اس طہارت سے

عابد معروف مغل

غزل

تمہارے پہلو میں لا کر بٹھائے جائیں گے
خدا کے سامنے جب ہم بلائے جائیں گے

ہمیں پتہ ہے کہ اب آنے والی نسلوں کو
ہمارے عشق کے قصے سنائے جائیں گے

ہمارے بعد بھی یہ رسم رک نہ پائے گی
تمہارے نام عریضے بہائے جائیں گے

صراطِ حق پہ ہیں سو جانتے ہیں پہلے سے
ہماری راہ میں کانٹے بچھائے جائیں گے

وہاں پہ دھرتی کے غدار ہی جنم لیں گے
ضمیر بیچ کے جب سر بچائے جائیں گے

کوئی بھی ایک تجھے چھوڑ کر نہ جائے گا
چراغ جب سرِ خیمہ بجھائے جائیں گے

تاثیر جعفری

غزل

ہاتھ اٹھے خدا اداسی کا
کارخانہ بنا اداسی کا

سانس تھمنے لگا ہے اب میرا
حل بتا دوستا اداسی کا

اشک رنگین ہو نہ پائے مرے
فائدہ کیا ہوا اداسی کا

خال و خد نہ تباہ کر اپنے
ڈھونڈ لے حل نیا اداسی کا

مجھ سے پیاسے کو آخرش لوگو
گھونٹ بھرنا پڑا اداسی کا

تیرے جانے سے سات نسلوں میں
چل پڑا سلسلہ اداسی کا

اسد رضا سحر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دستِ ہَوا سے پرتوِ ادراک ہو گئے
بادل بکھر کے دامنِ صَد چاک ہو گئے

غزل

اس نے پہلے ایک نظر سے مجمعے کو تنویم کیا
اپنی ساحر آنکھوں سے پھر پتھر کو دونیم کیا

پہلے اس نے حرف اجالے ہونٹ کی دھیمی جنبش سے
پھر البیلی آنکھوں سے ان حرفوں کو تفہیم کیا

جانے کیسا جادو تھا ان دو تنویمی آنکھوں میں
یعنی اس نے جو بھی بولا ہم نے سب تسلیم کیا

پہلے ایک نگاہ سے جانچا اہل جنوں کی ہستی کو
ساقی نے پھر دیوانوں میں جامِ نظر تقسیم کیا

آخر سب دیوان جلا کر اس کو دیکھنے آئے تھے
گرچہ کیا کیا غزلیں لکھ کر آنکھوں کو ترسیم کیا

محمد نور آسی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہوا کے دوش پہ اب تک سفر میں ہیں خالد
ہم اپنے شہر سے نکلے تھے، داستاں کی طرح

غزل

لفظِ آرام کی تفسیر میں تم رہتے ہو
میرے ہر خواب کی تعبیر میں تم رہتے ہو

جو اٹھائی تھی کبھی خواب سجانے کے لیے
دل کی اس خاص سی تعمیر میں تم رہتے ہو

داد ملتی ہے زمانے سے بہت ہی مجھ کو
لفظ میرے ہیں پہ تاثیر میں تم رہتے ہو

جو بھی لکھتی ہوں بہت نام کیا کرتا ہے
میرے ہر شعر میں تحریر میں تم رہتے ہو

جتنے بھی خاص مناظر ہیں زمانے میں سمن
ان کے ہر نقش میں تصویر میں تم رہتے ہو

رخسانہ سمن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

لباسِ خاک میں سوگل چھپائے پھرتے تھے
ہم اپنے گرد تھے ، دیوارِ گلستاں کی طرح

غزل

تیرے لہجے میں جو شقاوت ہے
رسم دنیا سے اک بغاوت ہے

عادتیں چھوٹ بھی تو سکتی ہیں
ساتھ تیرا تو میری عادت ہے

خواہشیں دستکیں بھی دیں تو کیا
آرزو ہے نہ اب ارادت ہے

تجھ سے شکوہ بھی تھا؛ نہیں بھی تھا
بیج کانٹوں کی یہ رفاقت ہے

قافلہ لوٹ کر یہ کہتے ہو
میرے ہی بخت میں ذلالت ہے

دید کی تشنگی نہیں جاتی
دیکھنا تجھ کو اک عبادت ہے

کاش تم چھوڑ کر نہیں جاتے
زندگی درد سے عبارت ہے

نائلہ راٹھور

غزل

چراغ بجھنے کا تُجھ کو اگر ملال نہیں
سو خود بتا تُو اندھیرے کا ہم خیال نہیں

ہماری سانس سے چلتی ہے کائنات کی سانس
ہماری سانس کا چلنا بھی اک کمال نہیں

کبھی جہاں سے محبت کبھی تمہارے ساتھ
کُھلا کہ اپنی طبیعت میں اعتدال نہیں

مجھے فلک سے اتارا تھا کس لیے تُو نے
اگر زمیں پہ کسی کا بھی کوئی حال نہیں

وہ جس کو دیکھنے والوں کے ہوش جاتے رہیں
میں اُس سے آنکھ ملاؤں میری مجال نہیں

سید تیمور کاظمی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

رنگ کہتے ہیں کہانی میری
کس کی خُوشبُو تھی جوانی میری

غزل

بھر جانے دو ذرا مرا ظرفِ جگر ابھی
زندان کا نہ کھولنا تم آ کے در ابھی

اتری ہے پات پات پہ پاگل رتوں کی دھوپ
چندھیا رہی ہے اس لیے میری نظر ابھی

مدت ہوئی ہے آتشِ دل کو بجھے ہوئے
سانسوں پہ ہے مگر وہ دھویں کا اثر ابھی

اٹھنے کو رنج و غم کے بگولے ہیں دھوپ میں
صحرائے چشم میں نہ بنا رہ گزر ابھی

اک لاج ہی نہیں یہ وفا کو خراج ہے
بدلی میں چھپ رہا ہے بھلا کیوں قمر ابھی

یعنی یہ مضطرب سی نظر بے سبب نہیں
خط لے کے آ رہا ہے کوئی نامہ بر ابھی

عادلؔ ابھی تو آیا نکل کر ہے چاہ سے
رستے پہ الجھنوں کے نہیں پاؤں دھر ابھی

عزیز عادل

غزل

کس طرح میرے سامنے اتنا سمٹ گیا
دشتِ طلب کا فاصلہ پل بھر میں کٹ گیا

مجھ کو ہوا ہے علم درختوں کے شور سے
اہلِ سخن کا رزق پرندوں میں بٹ گیا

جھیلا گیا نہ مجھ سے جو تنہائی کا عذاب
مجھ سے مرے وجود کا سایہ لپٹ گیا

حیران ہو رہا ہوں محبت کی راہ پر
اک شخص آتے آتے اچانک پلٹ گیا

دیکھا نہیں کسی کا مکمل وجود ہو
ہر شخص زندگی کے تقاضوں میں بٹ گیا

اک گلبدن کے نام سے منسوب کوئی شخص
سرمایۂ حیات کا کاسہ پلٹ گیا

محمد علی ایاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مجھ پہ ترے غم کا سائبان رہا ہے
دشت میں بھی سر پہ آسمان رہا ہے

غزل

جب لگا مرکزی کردار کی صورت نہ رہی
اس کی اک لکھی کہانی سے بھی رغبت نہ رہی

جس میں شامل تھے خشوع اور خضوع اب شاید
معبدِ دل میں وہ جذبوں کی عبادت نہ رہی

عکس جب اپنا نظر آنے لگا دھندلایا
آئنہ شعر کا بھی توڑا محبت نہ رہی

بے نیازی سے گزر جاتی ہوں جب دیکھتی ہوں
وہ ہنسی میری مسرت کی ضمانت نہ رہی

اس کے چہرے سے بھی اب رونقیں کافور ہوئیں
اس کے شعروں میں بھی پہلے سی لطافت نہ رہی

اب وہ دریا بھی بہاتا ہے تو ہنس دیتی ہوں
قابلِ فہم ہی اشکوں کی عبارت نہ رہی

مہر و اخلاص کی دولت بھی کہاں کام آئی
اس پہ جب میری نگاہوں کی عنایت نہ رہی

نظر انداز کیے رکھتی ہوں میں بھی پہروں
اسے بھی میرے رویے سے شکایت نہ رہی

جان جائے گا سفر مہنگا پڑا ہے کتنا
جب اسے لوٹ کے آنے کی اجازت نہ رہی

عنبرین اس میں خطا میری کہاں سے آئی
زندہ رہنے کی ہی جب اس کو ضرورت نہ رہی

عنبرین خان

غزل

خانۂ دل کیے ویران کہاں جاتا ہے
یہ تری یاد کا سامان کہاں جاتا ہے

حیرتی ہوں کہ فقط ایک گلی دیکھنے سے
شہرِ دل میں مچا طوفان کہاں جاتا ہے؟

زرد پھولوں میں گُلِ سرخ کا منظر کوئی
''کیا بتاؤں کہ مرا دھیان کہاں جاتا ہے؟''

شام سے پہلے ہوا آنکھ سے اوجھل سُورج
کوئی دیکھے کہ یہ نادان کہاں جاتا ہے

تیری خاطر میں سبھی کارِ جہاں چھوڑ آیا
یوں ملاقات کے دوران کہاں جاتا ہے؟

اپنی وحشت مری آنکھوں کے حوالے کر کے
اتنی عجلت میں بیابان کہاں جاتا ہے؟

سوچتا ہوں کہ گزرگاہِ زمانہ سے علی
آدمی آدمی ہلکان کہاں جاتا ہے

مہر علی

غزل

دشتِ ہجراں میں نیا پھول کھلانے والا
تو ہے خوابیدہ محبت کو جگانے والا

تیری یادوں نے کیا سانس بھی لینا مشکل
راہ تکتے رہے آیا نہیں آنے والا

سب سے پوچھا ہے کوئی ہم کو بتائے آخر
کیسے ملتا ہے کوئی ساتھ نبھانے والا

ہجر زادہ ہوں محبت پہ یقیں ہے کامل
آ ہی جائے گا مجھے چھوڑ کے جانے والا

اس نے آنگن کے مہکنے کی بشارت دی تھی
اب پریشان ہے تعبیر بتانے والا

اس کے رستوں میں بچھائیں گے یہ پرنم پلکیں
کوئی آئے تو سہی بھاگ جگانے والا

اب تو خوابوں میں ہی وہ شخص ملا کرتا ہے
میری آنکھوں سے کئی خواب چرانے والا

عزیز قدیر مغل

غزل

شبِ سیاہِ مسلسل میں اِک اُجالا تھا
میں اپنے وقت کا سب سے بڑا حوالہ تھا

میں تم سے پہلے اُداسی کو پالتا تھا کہیں
تمھارے بعد اُداسی نے مجھ کو پالا تھا

تمھارے ہجر کو دل سے نکالنا ہی پڑا
نئے مکان میں یوں بھی پُرانا جالا تھا

بس ایک بار نظر چُوکتے ہی ٹوٹ گیا
تمام عمر جسے ہم نے دیکھا بھالا تھا

وہ خود بلائے گا واپس میں جانتا ہوں عظیم
حدودِ وقت سے جس نے مجھے نکالا تھا

فخر عظیم

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خالد نمازِ مدح ادا ہو تو کس طرح
کس نم مہک سے تیرے ثناگر وضو کریں

غزلیں

میں چپ رہوں مرے اندر سے حشر سا اٹھے
وجود کانپ اٹھے درد بے بہا اٹھے

میں اپنے گھر کو میسر کچھ اس طرح سے رہوں
چلا بھی جاؤں تو کمرے سے قہقہہ اٹھے

یقین جانیں یہ توہین ہے محبت کی
ہمارے حق میں اگر کوئی بے وفا اٹھے

میں جینا چاہتا ہوں زندگی تجھے کچھ دن
کوئی تو ہو جو مرے ساتھ مسکرا اٹھے

خدا شناس نہیں ہو سکے ترے بے کار
پھر ایک دن کسی وحشت میں مبتلا اٹھے

جنابِ میر سے ساجد جب اُٹھ نہیں پایا
یہ بارِ ہجر ہے مجھ ناتواں سے کیا اٹھے

ساجد رضا خان

کتنے گنجل پڑ جاتے ہیں ایک گرہ سلجھانے میں
عمر ٹھکانے لگ جاتی ہے ریت پہ پھول بنانے میں

تخت پہ بیٹھا سوچ رہا ہوں مار دیئے ہیں کتنے لوگ
قصر کے اونچے دو برجوں پر ایک علم لہرانے میں

دھرتی کے قدموں پر میری پیشانی کا شملہ ہے
اور کہاں تک جھکنا ہو گا اپنا بوجھ اٹھانے میں

تم تو شہد اتار کے واپس آجاتے ہو جنگل سے
کتنی آنکھیں لگ جاتی ہیں درد کی آگ بجھانے میں

اب اجداد کی قبریں کھود کے پوچھ رہے ہیں ماضی سے
مستقبل محفوظ کیا تھا تم نے کس تہہ خانے میں

جسموں کے عرشے پر بیٹھ کے ہم نے دریا پار کیا
جانے کتنے دن لگ جاتے کشتی کے بھر جانے میں

باغِ بغاوت مہک اٹھے گا اس کو خون سے مت سینچو
ورنہ دیمک لگ جائے گی طاقت کے کاشانے میں

ان بانہوں کی گونج میسر ہے میری خاموشی کو
پھر کوئی آواز سنائی کیسے دے ویرانے میں

عبرت کا جزدان کھلا تو حیرت سے ہلکان ہوئے
کیسے کیسے غم بکھرے ہیں دنیا کے خس خانے میں

اپنا آپ انڈیل دیا ہے پھر بھی صراحی خالی ہے
جانے کس کا جام بھرے گا دنیا کے میخانے میں

منیر جعفری

غزل

تاریک ہے ، ویران ہے دل کتنا ہمارا
اب اِس پہ اتارو کوئی بے نام سِتارا

اُس پر ہے بہت ناز اسیرِ اَزلی کو
جس نے اُسے پہلے کسی منظر سے اُبھارا

بھرتا ہوں خلا اپنا کسی طور وہاں سے
جب دیکھنے لگتا ہوں کہیں اپنا کنارا

آیا نہ کبھی میری مدد کو کسی دن وہ
میں نے اُسے ہر روز بہت دیر پُکارا

اُس کو ہو بھلا تنگیٔ دوراں سے گلہ کیوں
کرتا ہو جو بیساکھیٔ حالت پہ گُزارا

مُشتاق بہت عالمِ حیرت میں تھی اک سوچ
پھر اُس نے فلک سے کوئی اک بھید اُتارا

زاہد خان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یہ لوگ تو آنسو بھی بہانے نہیں دیتے
نیکی کو بھی دریاؤں تک آنے نہیں دیتے

غزلیں

نہ وہ شے میں نہ ضمنِ شے میں آئے
کوئی کیسے اسے پہچان پائے

جو دیکھے وہ ورائے دید دیکھے
دلوں کی آنکھ دیکھے اور دکھائے

پئے عرفاں نہیں قابل بیاں جو
اسے کیوں کر کوئی لفظوں میں لائے

نظربازوں کے جملہ زاویوں سے
حقیقت ہر قدم آگے بڑھائے

رسائی بھی اسدؔ ہے نارسائی
ورائے سمت رستہ کٹتا جائے

غلام شبیر اسد

دل کو اب رنجش و آزار سے ڈر لگتا ہے
یہ وہ سایہ جسے دیوار سے ڈر لگتا ہے

میں نے اس واسطے انکار کیا یاروں کو
جیب خالی ہو تو بازار سے ڈر لگتا ہے

میں محبت پہ بہت پختہ یقیں رکھتا ہوں
بس مجھے ہجر کی تلوار سے ڈر لگتا ہے

جب بھی ڈھلتے ہوئے سورج پہ نظر جاتی ہے
جانے کیوں وقت کی رفتار سے ڈر لگتا ہے

میں وہ احساس کا ناکام مصنف ہوں جسے
خود کہانی کے ہی کردار سے ڈر لگتا ہے

دن کو چپ بیٹھیں تو خاموشی نگل جاتی ہے
شام ہوتی ہے تو گفتار سے ڈر لگتا ہے

جانے کب پھوڑ دوں سر اپنا میں وحشت میں حسن
اس لیے اب در و دیوار سے ڈر لگتا ہے

محمد بلال حسن

غزلیں

کوئی رونق نہیں کہانی کی
بات سب نے اگر پرانی کی

سخت نالاں ہے سخت مضطر ہے
بات سُن لی ہے میں نے پانی کی

سینکڑوں غم تھے میری چوکھٹ پر
میں نے ہر اک کی میزبانی کی

شعر کہنا دلوں میں گھر کرنا
اچھی کوشش ہے راجدھانی کی

مجھ کو جڑ سے اُسی نے کاٹا ہے
جس پہ بے لوث سائبانی کی

قُرب تیرا نصیب ہے جب تک
کیا ضرورت ہے حکمرانی کی

اُس کو جامی سمجھ نہ آئے گی
میری وحشت بھری جوانی کی

مستحسن جامی

نظر پہ وقت کی چال آشکار ہوتے ہوئے
خزاں کی نذر ہوئے ہم، بہار ہوتے ہوئے

یہ بات ڈال گئی خواہشِ نمود پہ خاک
کہ لوگ خاک ہوئے شاندار ہوتے ہوئے

میں چاہتا تھا تعلق بحال ہو ہر دم
سو بیوقوفیاں کیں، ہوشیار ہوتے ہوئے

نہ کوئی گردشِ قسمت، نہ کوئی گردشِ چشم
بہت اکیلا پڑا ہوں مدار ہوتے ہوئے

بتا رہا ہوں مرے ساتھ اتنا مت کھیلو
میں گرہ دار بھی ہوں پائدار ہوتے ہوئے

نظر کا تیر جو اس نے مری طرف پھینکا
سکون چھین گیا آر پار ہوتے ہوئے

تجھے تو علم نہیں ہے، مگر حسین بدن!
ترس رہا ہوں تجھے آبشار ہوتے ہوئے

ٹھہر اے شدتِ غم! ٹوٹ جائے گا لشکر
میں گر پڑوں گا اگر شہسوار ہوتے ہوئے

علی آرش

غزلیں

عمر فدا

ہر ربط تو بڑھا لیا تُم نے کِسی طرح
اب اُس سے عشق کر کے دِکھانا مری طرح

یوں میرے ساتھ تُند مزاجی برتتے شخص
تو سوچ تیرے ساتھ کروں گر تری طرح

حالات ہو گئے ہیں مرے پھر سے اچھے اب
پھر سے کرو عزیزو ، محبت اُسی طرح

وہ جب کبھی بھی کہتا مجھے ترکِ عشق کا
لگ جاتا تھا تڑپنے ، مرا دل بُری طرح

اُس کے حصول کے لیے جاں دینے کے سوا
جو ہو سکی، کی میں نے وہ کوشش سبھی طرح

یہ زیست ایک مرتبہ موقع تو دیتی دوست
اس بار آنا چاہتا تھا میں ، نئی طرح

دکھ یہ ہے، اُس نے میری طرف دیکھا تک نہیں
میں نے اُسے بُلانا بھی چاہا کئی طرح

اور عشق کیسے کرتے ہیں یہ میں سکھاؤں گا
بس یارو ! مان جائے وہ لڑکی کسی طرح

رضوان رضی

کوئی خوشی سے تو ہرگز جدا نہیں ہوتا
بچھڑنے والے میں تجھ سے خفا نہیں ہوتا

پرندے اپنا ٹھکانہ بدلتے رہتے ہیں
چمن میں ایک سا موسم سدا نہیں ہوتا

ہم اپنی طرز سے ہی زندگی گزارتے ہیں
ہمارے ہاتھوں پہ کچھ بھی لکھا نہیں ہوتا

ہوائیں توڑ تو دیتی ہیں بے دلی سے مگر
شجر سے ٹوٹ کے پتا ہوا نہیں ہوتا

فقیہہ شہر تو مسجد بنا کے نازاں ہے
مگر وہ لوگ کہ جن کا خدا نہیں ہوتا

ابولہب

''ٹوٹ گئے ابولہب کے ہاتھ اور نامراد ہو گیا وہ۔ اس کا مال اور جو کچھ اس نے کمایا وہ اس کے کسی کام نہ آیا۔ ضرور وہ شعلہ زن آگ میں ڈالا جائے گا اور (اس کے ساتھ) اس کی جورو بھی، لگائی بجھائی کرنے والی، اس کی گردن میں مونجھ کی رسّی ہوگی۔'' (۱۱۱ : ۱ تا ۵)

اس شخص کا اصل نام عبدالعُزّیٰ تھا اور ابولہب اس لیے کہا جاتا تھا کہ اس کا رنگ بہت چمکتا ہوا سرخ وسفید تھا۔ لہب آگ کے شعلے کو کہتے ہیں اور ابولہب کے معنے ہیں شعلہ رُو۔ وہ زیادہ تر اپنے نام کے بجائے اپنی کنیت ہی سے معروف تھا۔ عبدالعزّیٰ مشرکانہ نام تھا اس لیے قرآن میں اس نام کو پسند نہ کیا گیا۔ ابولہب نے رسولؐ اللہ کی دعوت کو زک دینے کے لیے اپنا پورا زور لگا دیا تھا۔ لیکن اس سورۃ کے نزول پر سات آٹھ سال ہی گزرے تھے کہ جنگ بدر میں قریش کے اکثر و بیشتر وہ بڑے بڑے سردار مارے گئے جو اسلام دشمنی میں ابولہب کے ساتھی تھے۔ مکہ میں جب اس شکست کی خبر پہنچی تو اس کو اتنا رنج ہوا کہ وہ سات دن سے زیادہ زندہ نہ رہ سکا۔ اس کی موت بھی نہایت عبرتناک تھی۔ اسے ایسی بیماری ہو گئی تھی کہ اس کے گھر والوں نے چھوت کے خوف سے اسے چھوڑ دیا۔ مرنے کے بعد بھی تین روز تک کوئی اس کے پاس نہ آیا یہاں تک کہ اس کی لاش سڑ گئی اور بدبو پھیلنے لگی۔ جب لوگوں نے اس کے بیٹوں کو طعنے دیئے تو ایک روایت کے مطابق انھوں نے چند حبشی مزدوروں کو اجرت دے کر لاش اٹھوائی اور دفن کروائی۔ دوسری روایت کے مطابق ایک گڑھا کھود کر لکڑیوں سے اس کی لاش کو دھکیلا اور گڑھے میں پھینک کر اوپری مٹی ڈال دی۔ جس دین کی راہ روکنے کے لیے اس نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا اس دین کو اس کی اولاد نے قبول کیا۔ سب سے پہلے اس کی بیٹی درّہ ہجرت کر کے مکہ سے مدینہ پہنچیں اور اسلام لائیں پھر فتح مکہ کے موقع پر اس کے دونوں بیٹے عُتبہ اور معتّب حضرت عباسؓ کی وساطت سے حضور کے سامنے پیش ہوئے اور ایمان لا کر انھوں نے آپ کے دست مبارک پر بیعت کی۔

ابولہب بن عبدالمطّلب حضور کا چچا تھا۔ جب حضور کو دعوت عام پیش کرنے کا حکم دیا گیا اور

پیروز بخت قاضی

قرآن مجید میں یہ ہدایت نازل ہوئی کہ آپ اپنے قریب ترین عزیزوں کو سب سے پہلے خدا کے عذاب سے ڈرائیں تو آپ نے صبح سویرے کوہ صفا پر چڑھ کر بلند آواز سے پکارا "ہائے صبح کی آفت" عرب میں یہ صدا وہ شخص لگاتا تھا جو صبح کے جھٹ پٹے میں کسی دشمن کو اپنے قبیلے پر حملہ کرنے کے لیے آتے دیکھ لیتا تھا۔ حضور کی یہ پکار سن کر قریش کے تمام خاندانوں کے لوگ آپ کی طرف دوڑ پڑے۔ جب سب جمع ہو گئے تو آپؐ نے قریش کے ایک ایک خاندان کا نام لے کر پکارا اور کہا کہ اگر میں تمھیں یہ بتاؤں کہ پہاڑ کے پیچھے ایک لشکر تم پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہیں تو تم میری بات سچ مانو گے؟ لوگوں نے کہا ہاں، ہمیں کبھی تم سے جھوٹ سننے کا تجربہ نہیں ہوا۔ آپ نے فرمایا تو میں تمھیں خبردار کرتا ہوں کہ آگے سخت عذاب آرہا ہے۔ قبل اس کے کہ کوئی اور بولتا حضورؐ کے اپنے چچا ابولہب نے کہا "ستیاناس جائے تیرا کیا تو نے اس لیے ہمیں یہاں جمع کیا ہے؟" ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس نے پتھر اٹھایا تاکہ رسولؐ اللہ پر کھینچ مارے۔

ابن زید کی روایت ہے کہ ابولہب نے رسولؐ اللہ سے ایک روز پوچھا اگر میں تمھارے دین کو مان لوں تو مجھے کیا ملے گا؟ تو آپ نے فرمایا جو اور سب ایمان لانے والوں کو ملے گا۔ اس نے کہا میرے لیے کوئی فضیلت نہیں ہے؟ حضور نے فرمایا اور آپ کیا چاہتے ہیں؟ اس پہ وہ بولا "ناس جائے اس دین کا جس میں مَیں اور یہ دوسرے لوگ برابر ہوں۔"

مکہ میں ابولہب حضور کا قریب ترین ہمسایہ تھا۔ دونوں گھروں کے بیچ ایک دیوار واقع تھی۔ اس کے علاوہ اور لوگ بھی آپ کے ہمسائے تھے۔ یہ لوگ گھر میں بھی حضور کو چین نہیں لینے دیتے تھے۔ کبھی نماز کی حالت میں آپ پر بکری کی اوجھری پھینک دیتے، کبھی صحن میں کھانا پک رہا ہوتا تو یہ ہنڈیا پر غلاظت پھینک دیتے۔ ابولہب کی بیوی ام جمیل (ابوسفیان کی بہن) نے تو یہ مستقل وتیرہ ہی اختیار کر رکھا تھا کہ راتوں کو آپ کے گھر کے دروازے پر خاردار جھاڑیاں لاکر ڈال دیتی تاکہ صبح سویرے جب آپ یا آپ کے بچے باہر نکلیں تو کوئی کانٹا پاؤں میں چبھ جائے۔

نبوت سے قبل آپ کی دو صاحبزادیاں ابولہب کے دو بیٹوں عُتبہ اور عُتیبہ سے بیاہی ہوئی تھیں۔ جب حضور نے اسلام کی دعوت دینی شروع کی تو ابولہب نے اپنے دونوں بیٹوں سے کہا کہ میرے لیے تم سے ملنا حرام ہے اگر تم محمدؐ کی بیٹیوں کو طلاق نہ دے دو۔ چنانچہ دونوں نے طلاق دے دی۔ خبیثہ جہالت میں اس قدر بڑھ گیا کہ ایک روز حضور کے سامنے آکر ان کی طرف تھوکا جو آپ پر نہیں پڑا۔ اس پر حضور نے فرمایا "خدایا اس پر اپنے کتوں میں سے ایک کتے کو مسلط کر دے۔" اس کے بعد عتیبہ اپنے باپ کے ساتھ شام کے سفر پر روانہ ہوا۔ دورانِ سفر قافلے نے ایک ایسی جگہ پڑاؤ کیا جہاں مقامی لوگوں نے بتایا کہ راتوں کو درندے آتے ہیں۔ ابولہب نے اپنے ساتھی اہلِ قریش سے کہا کہ میرے بیٹے کی حفاظت کا کچھ انتظام کرو کیونکہ

مجھے محمدؐ کی بددعا کا خوف ہے۔ اس پر قافلے والوں نے عتیبہ کے گرد ہر طرف اپنے اونٹ بٹھا دیئے۔ رات کو ایک شیر آیا اور اونٹوں کے حلقے میں سے گزر کر اس نے عتیبہ کو پھاڑ کھایا۔

جب رسولؐ اللہ کے صاحبزادے حضرت قاسم کے بعد دوسرے صاحبزادے عبداللہ کا بھی انتقال ہو گیا تو ابولہب اپنے بھتیجے کے غم میں شریک ہونے کے بجائے خوشی خوشی دوڑتا ہوا قریش کے سرداروں کے پاس پہنچا اور ان کو خبر دی کہ لو آج محمدؐ بے نام ونشان ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس غم کی حالت میں حضور پر سورۂ کوثر کی تین آیات نازل فرمائیں کہ:

''(اے نبیؐ) ہم نے تمھیں کوثر عطا کیا۔ پس تم اپنے رب ہی کے لیے نماز پڑھو اور قربانی کرو۔ تمھارا دشمن ہی جڑ کٹا ہے۔'' (۱۰۸: ۱ تا ۳)

رسولؐ اللہ جہاں بھی اسلام کی دعوت دینے کے لیے تشریف لے جاتے یہ آپ کے پیچھے پیچھے جاتا اور لوگوں کو آپ کی بات سننے سے روکتا۔ نبوت کے ساتویں سال جب قریش کے تمام خاندانوں نے بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کا معاشرتی اور معاشی بائیکاٹ کیا اور یہ دونوں خاندان رسولؐ اللہ کی حمایت پر ثابت قدم رہے اور شعب ابی طالب میں محصور ہو گئے تو تنہا یہی ابولہب تھا، جس نے اپنے خاندان کا ساتھ دینے کے بجائے کفارِ قریش کا ساتھ دیا۔ یہ مقاطعہ تین سال تک جاری رہا اور اس دوران بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب پر فاقوں کی نوبت آ گئی۔ جب مکہ میں کوئی تجارتی قافلہ آتا اور شعب ابی طالب کے محصورین میں سے کوئی خوراک کا سامان خریدنے جاتا تو ابولہب پکار کر کہتا کہ ان سے اتنی قیمت مانگو جو یہ ادا نہ کر سکیں، تمھیں جو خسارہ بھی ہو گا میں پورا کر دوں گا۔ یہ اس شخص کی حرکات تھیں جس کی بنا پر اس سورۃ میں نام لے کر اس کی مذمت کی گئی۔

ابولہب کی بیوی کا نام اُروٰی تھا اور اُمِ جمیل اس کی کنیت تھی۔ یہ ابوسفیان کی بہن تھی اور رسولؐ اللہ کے ساتھ عداوت میں اپنے شوہر سے کسی طرح کم نہ تھی۔ حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی حضرت اسماءؓ کا بیان ہے کہ جب یہ سورۃ نازل ہوئی اور اُمِ جمیل نے اس کو سنا تو وہ بپھری ہوئی رسولؐ اللہ کی تلاش میں نکلی۔ اس کے ہاتھ میں مٹھی بھر پتھر تھے اور وہ حضورؐ کی ہجو میں اپنے ہی کچھ اشعار پڑھتی جاتی تھی۔ حرم میں پہنچی تو وہاں ابوبکرؓ کے ساتھ حضورؐ تشریف فرما تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا یا رسولؐ اللہ یہ آ رہی ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کو دیکھ کر یہ کوئی بیہودگی کرے گی۔ حضور نے فرمایا یہ مجھے نہیں دیکھ سکے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ آپ کے موجود ہونے کے باوجود وہ آپ کو نہ دیکھ سکی۔ اور اس نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ میں نے سنا ہے تمھارے صاحب نے میری ہجو کی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ اس گھر کے رب کی قسم انھوں نے تو تمھاری کوئی ہجو نہیں کی۔ اس پر وہ واپس چلی گئی۔ ابوبکرؓ کے اس جواب کا مطلب یہ تھا کہ ہجو تو اللہ تعالیٰ نے کی ہے، رسولؐ اللہ نے نہیں کی۔

☆☆☆☆☆

وحشت ہی سہی

استانی زبیدہ نے گھڑی دیکھی۔ گھر جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی چیزیں سمیٹیں اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ سکول اس وقت خالی ہونا شروع ہو جاتا تھا مگر آج تو سب کچھ ویسے ہی خالی خالی اور ٹوٹا پھوٹا لگ رہا تھا۔ وادی کو جھنجھوڑ دینے والے زلزلے نے سکول کی بلڈنگ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ ہر طرف تباہی کے آثار، بربادی کے مظاہر تھے اور بس ویرانی اور خاموشی۔ بچے بھی نہیں آئے تھے کیونکہ بچّے بچے ہی نہیں تھے۔ پھر وہ خود نہ جانے کیوں سکول چلی آئی تھی؟ چوکیدار بابا اسے سکول کے ملبے پر گم صم بیٹھا دیکھ کر بلک بلک کر رو دیا۔

استانی زبیدہ کا اپنا کوئی بچہ تو تھا نہیں مگر اسے سکول کے سبھی بچے اپنے بچے لگتے تھے۔ بچے کی خواہش البتہ اس کے دل سے کبھی ختم نہ ہوئی تھی مگر وہ کیا کرتی؟ اس کی کبھی شادی ہی نہیں ہوئی تھی۔ چالیس سال کی عمر کو پہنچتے پہنچتے اب اس کے اندر ماں بننے کی حسرت بھی دھیرے دھیرے دم توڑتی چلی جا رہی تھی۔

زلزلے کی وجہ سے شہر میں بہت سے سوشل ورکرز، ڈاکٹرز، این جی اوز کے ارکان کی ٹیمیں آئی ہوئی تھیں جو متاثرین کی مدد، علاج، خوراک و رہائش کا انتظام کرنے میں تندہی سے مصروف تھیں استانی زبیدہ بھی والنٹیئر کام کرنے پہلے صبح ہسپتال ہی گئی تھی مگر پھر نہ جانے جی میں کیا سمائی کہ سکول چلی آئی۔ حالانکہ وہاں اب چند اینٹوں، پتھروں کے علاوہ کچھ تھا ہی نہیں۔ شاید اس لیے کہ سکول اس کے لیے ایک اپنی دنیا تھی۔ ایسی دنیا جہاں جیتے جاگتے انسان ہوا کرتے تھے اور وہ انہی کے ذریعے اپنی بے رنگ زندگی میں رنگ بھرنے کی کوشش کرتی تھی ورنہ گھر میں تو اس کے علاوہ صرف ایک بوڑھی ماں اور سناٹا رہتا تھا۔

ماں جسے ہر وقت اپنی بیٹی کی تنہا، ویران زندگی کی فکر اور اپنے مر جانے کا خوف پریشان رکھتا تھا۔ وہ مرنا بھی اسی لیے نہیں چاہتی تھی کہ پھر اس کے بعد اس کی زبیدہ نے تنہا رہ جانا تھا۔ اماں کا بھی آگا پیچھا کوئی نہ تھا، اس لیے دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے کے کمزور سہارے پر زندگی جیئے چلی جا رہی تھیں۔ سکول کی طرف سے ملے ہوئے اس گھر میں رہتے ہوئے اب انھیں بہت سے

نیلم احمد بشیر

سال ہو گئے تھے۔ قدرتی مناظر سے مالا مال اس خوبصورت وادی میں رہتے رہتے وہ اس کی اتنی عادی ہو گئی تھیں کہ اب ان کا کہیں اور جانے کو من ہی نہیں کرتا تھا۔ وہ خود کو اس پہاڑی علاقے کا ایک منظر سمجھنے لگ گئی تھیں۔

اماں کبھی کبھار شہر جا کر اپنے شوہر کی قبر پر فاتحہ پڑھنے اور پھول چڑھانے کو ضرور بے قرار ہو جاتیں مگر اکثر وہ اپنی اس آرزو کو دل میں ہی دبا لیتیں، زبیدہ کو اکیلا چھوڑ کر جانے کا ان میں حوصلہ نہ پیدا ہوتا تھا۔

''اماں آپ بابا کی قبر پر ہو آئیں۔ میں ٹھیک رہوں گی۔ چوکیدار بابا بھی تو پیچھے کی کوٹھڑی میں ہی ہوتا ہے۔ مجھے کونسا کسی شیر بھیڑیے نے آ کر کھا جانا ہے۔'' وہ لاڈ سے اماں کے گلے میں بازو ڈال کر ہنسنے لگتی۔

جواباً اماں بھی ہنس دیتی اور کہتی ''نہ بابا نہ، میں اپنی جوان بچی کو اکیلا چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہوں۔ تو فضول ضد نہ کیا کر کرنے دے انتظار اپنے ابا کو۔''

''میں اور جوان.....؟'' استانی زبیدہ ٹھنڈی سانس بھرتی۔ ''اب میں بھلا کہاں جوان ہوں اماں۔ بڑھیا بنتی جا رہی ہوں تو میری فکر نہ کیا کر، میں اپنا خیال اچھی طرح رکھ سکتی ہوں۔'' وہ تحمل سے جواب دیتی۔

''اللہ رکھے بوڑھے ہوں تیرے دشمن۔ ارے ابھی تیری عمر ہی کیا ہے۔ نہ بیٹا ایسی باتیں نہیں کرتے۔ خیر سے تیری شادی ہونا ہے.....''

اماں اپنا گھسا پٹا راگ الاپنے لگتیں تو زبیدہ بیزاری سے منہ دوسری طرف کر لیتی۔

''ابھی تک میری شادی کے خواب دیکھ رہی ہے۔ ہنہ شادی..... اماں کا تو دماغ خراب ہے۔ سٹھیا گئی ہے۔'' وہ بڑبڑانے لگتی۔

اماں نے سالہا سال سے زبیدہ کی شادی کے لیے کپڑے بنوا رکھے تھے جو اب فیشن کے مطابق بھی نہ رہے تھے مگر اماں پھر بھی انھیں بکسے میں سینت سینت کر رکھتیں اور ان میں فینائل کی گولیوں کی تہیں جماتی رہتی تھیں۔ سرخ عروسی غرارہ سیٹ البتہ اب بھی خوبصورت اور تر و تازہ تھا۔ اماں کی اپنی شادی کا یہ جوڑا انھیں بے حد عزیز تھا۔ اکثر اسے نکال کر دیکھتیں اور خوش ہوتی رہتی تھیں کہ اب تک نیا کا نیا لگتا ہے۔

''زبیدہ میری بچی ذرا اسے اپنے ساتھ لگا کر دکھا تو سہی، کیسا لگتا ہے؟ انھوں نے کئی بار زبیدہ سے کہا مگر وہ نہ مانی۔ وہ سرخ عروسی چمکتا دمکتا جوڑا کبھی اپنے تن سے نہ لگایا۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیتی۔ کبھی کہتی مجھے سکول کے ٹیسٹ پیپرز چیک کرنے ہیں، کبھی کھانا پکانا ہے۔ کپڑے دھونا ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اماں کو اس نے کبھی وہ سرخ جوڑا پہن کر نہ دکھایا۔ کچھ کہہ کر اماں کا دل توڑنا نہ چاہتی تھی، اس لیے بس بہانے ہی بناتی رہتی۔

''دیکھنا ایک روز اک شہزادہ آئے گا اور تجھے بیاہ کر کہیں دور لے جائے گا۔'' اماں

داستانوں کی نانی اماں کی طرح کی کوئی بھولی بسری کہانی کے ٹکڑے سنانے لگ جاتیں۔ استانی زبیدہ خاموش رہتی۔ یوں جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ اسے لگتا وہ سرخ جوڑا بکسے میں چھپا کوئی زہریلا بچھو ہے۔ ہاتھ لگایا تو ڈنک مار دے گا۔

''یا اللہ میری پیاری بچی کی زندگی میں بھی بہار کے پھول کھلا دے۔ اسے بھی چاہے جانے کے خوبصورت تجربے سے روشناس کروے۔'' وہ دعائیں مانگتی رہتیں۔

اماں کی اپنی شادی شدہ زندگی بہت مطمئن اور پیار بھری گزری تھی۔ ان کے شوہر ان کے کس قدر ناز نخرے اٹھایا کرتے تھے۔ انھیں اچھے سے اچھا کھلاتے پلاتے، پہناتے اور ان کی ہر فرمائش پوری کرتے تھے۔ اماں اٹھتے بیٹھتے ان دنوں کو یاد کرتی رہتیں۔ ''اے کاش! میری بچی کو بھی ایسا کوئی جیون ساتھی مل جائے جو اسے جی بھر کے پیار کرے اور مکمل کردے۔ یہ محبت میں نہال ہو ہو جائے۔'' دعائیں مانگ مانگ کر اماں کا منہ سوکھ جاتا تھا مگر اللہ میاں نہ جانے کون سی بے نیازی کی چادر اوڑھے چپ سادھے بیٹھے تھے۔ کچھ سنتے ہی نہ تھے۔

شادی کا موضوع چھڑتے ہی زبیدہ کسی سانپ کی طرح پھن اٹھا لیتی۔ ''نہیں کرنی مجھے شادی۔ یہ ذکر نہ چھیڑا کریں اماں۔ میں اکیلی ہی ٹھیک ہوں۔''

وہ غصے میں آ جاتی تو اماں ڈر جاتیں اور کونوں میں چھپ چھپ کر آنسو بہانے لگتیں۔ بھولے بھٹکے جب کوئی رشتہ آیا بھی تو زبیدہ نے اس کے گھر والوں کو گھاس نہ ڈالی اور عورتیں ناامید ہی لوٹیں۔ بس کچھ ایسی ہی ہو کے رہ گئی تھی زبیدہ۔

زلزلے کو چار پانچ روز گزر چکے تھے۔ سکول جانا بھی بند ہو چکا تھا۔ زبیدہ سوچنے لگی۔ کپڑے بدل کر ہال بنا کر جاؤں تو کہاں جاؤں۔ پہلے کم از کم ایک آسرا تو تھا جہاں وہ کچھ وقت بچوں اور ساتھی استانیوں کے ساتھ ہنس بول کر گزار آتی تھی۔ اب تو بس گھر تھا، اماں کی اداسیاں، پریشانیاں، بیماریوں کے تذکرے اور بس۔ شکر ہے ان کا گھر کئی زوردار جھٹکے کھانے کے باوجود قائم رہا تھا۔ انگریز راج کا بنایا ہوا، وادی کے مضبوط پتھروں سے تعمیر شدہ۔ یہ بڑا سا پرانا گھر کسی وکٹورین عہد کے لکھے گئے ناولوں میں سانس لیتا محسوس ہوتا تھا۔ زبیدہ خیالوں خیالوں میں سوچتی، میں بھی شاید جین آئر (Jane Eyre) کی طرح اس بڑے سے قلعے نما گھر میں تنہا بھٹکتی کوئی روح ہوں۔ نہ جانے میرا انجام کیا ہوگا۔ کیا اس خوبصورت وادی کے پتھروں میں ہی میرا آخری ٹھکانہ چھپا ہے؟ اماں نہ ہوں گی تو میں کیا کروں گی؟

گھر کے چاروں طرف خوبصورت پھولوں اور رسدار پھلوں کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ قریب بہتے ٹھنڈے میٹھے کھنکناتے جھرنوں کی مدھر آواز سن کر اماں اکثر گنگنانے لگتیں۔ اماں کی آواز بہت اچھی تھی اور انھیں بہت

سے میٹھے میٹھے پرانے گیت یاد تھے۔ اس لیے اکثر چاول میں بگھار لگاتے، ان کی زبان سے نغمے جاری رہتے۔ ان کی پسندیدہ گلوکارہ نور جہاں کی ٹیپ ان کے کیسٹ پلیئر میں مستقلاً لگی رہتی۔ گانے سننے سے اماں کا بھی دل لگا رہتا۔ استانی زبیدہ کو موسیقی سے زیادہ کتابیں پڑھنے کا شوق تھا، اس لیے وہ اکثر کوئی کتاب بغل میں دبائے چپ چاپ اوپر کی منزل کی سیڑھیاں چڑھ جاتی اور پڑھتے پڑھتے نیند کی وادی میں گم ہو جاتی۔ یوں ہی اس کی شامیں گزرتی تھیں۔

شام کا وقت تھا..... چڑیاں شور مچا کر اپنے بال بچوں کو اکٹھا کر رہی تھیں۔ ہوا سرد ہو چلی تھی کہ یکدم گھر کا دروازہ کھٹکا۔ اماں نے اپنی عینک ناک پر ٹکا کر پوچھا ''کون ہے؟'' تو آواز آئی ..... ''ستائیس نمبر گھر یہی ہے؟'' چوکیدار بابا پہاڑی سے نیچے کچھ سامان لینے گیا ہوا تھا۔ کنڈی کھولنے والا کوئی نہ تھا۔

اماں نے زبیدہ کی طرف دیکھا جو اس وقت نہا کر اپنے گیلے بال تولیے پر پھیلائے رات کے کھانے کے لیے پودینے کی چٹنی پیسنے لگی تھی ''ٹھہر و اماں میں دیکھتی ہوں۔''

زبیدہ نے تولیہ ہٹا کر سر پر دوپٹہ لیا اور دروازے کی کنڈی کھول دی۔ آنے والا ایک قدم بڑھا کر اندر آ گیا اور آہستہ سے بولا۔ ''زوبی.....''

اُستانی زبیدہ سناٹے میں آ گئی۔ اس کا یہ نام تو صرف ایک ہی شخص کو معلوم تھا اور اب اتنے برسوں سے تو اس کے کان اس نام سے آشنا بھی نہ رہے تھے۔ استانی زبیدہ یوں پیچھے ہٹی جیسے اسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ نووارد قریباً پینتالیس برس کا مضبوط جسم والا مرد تھا۔ کنپٹیوں پر ہلکے ہلکے سفید ہوتے بال، سلیقے سے ترشی ہوئی ماڈرن طرز کی داڑھی، امپورٹڈ قیمتی پینٹ شرٹ میں ملبوس، سفید اوور آل ڈالے وہ سامنے کھڑا تھا۔ یہ وہی تو تھا جس کی وجہ سے وہ آج تک تنہا تھی۔ جس نے دس سال منگنی رکھنے کے بعد امریکہ پہنچ کر کسی گوری میم سے شادی کر لی تھی۔ کبھی پلٹ کر خبر تک نہ لی تھی کہ وہ زندہ تھی یا مردہ، کس حال میں تھی؟ کیا کرتی تھی؟

کون۔ کون ہے بھئی؟'' اماں کی آواز نے سناٹے کو چیر کر رکھ دیا۔ زبیدہ یکدم ہوش میں آ گئی۔ ''اماں_ ان صاحب سے کہو یہاں سے چلے جائیں۔'' وہ جلدی سے کہہ کر اندر بھاگ گئی۔ اس کے قدم الٹے سیدھے پڑ رہے تھے۔ سانس پھول رہا تھا۔ وہ بھاگتی ہوئی اوپر اپنے کمرے کی طرف گئی اور کھٹ سے دروازہ بند کر لیا۔ اسے یاد آ گیا۔ برسوں پہلے ایک بار پہلے بھی اس کا سانس اسی طرح پھولا تھا اور اس کی وجہ بھی یہی شخص تھا۔

اس بات کو گزرے برس ہا برس بیت چکے تھے مگر وہ بھول نہ سکی تھی۔ گرمیوں کی وہ دوپہر اسے یوں یاد تھی جیسے کل ہی کی بات ہو۔ گرمی کی شدت سے بے حال ہو کر گھر والے دوپہر کو چھتیں گرا کر گہری نیند سوئے ہوئے تھے کہ ساتھ والے گھر سے دیوار پھلانگ کر سجاد ان

کے ہاں چلا آیا۔ وہ اکثر یونہی دوپہر کے وقت اس کے بہاول پور سے آئے ہوئے چچیرے بھائی کو ملنے آجایا کرتا تھا۔ صدیق اور سجاد تپتی دوپہروں کو چھتوں، چوباروں پر گلی ڈنڈا، کرکٹ، ہاکی کھیلتے اور اودھم مچائے رکھتے۔ تیزی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے اچانک سجاد زبیدہ سے زور سے ٹکرا گیا جو چھت پر دھلے ہوئے کپڑے سکھانے جا رہی تھی۔ وہ ایک عجیب سالمحہ تھا، جس میں دونوں نے ایک دوسرے کو کھو جانے دیا۔ سجاد کا لمبا چوڑا وجود زبیدہ کے دبلے پتلے چڑیا جیسے بدن پر بادل کی طرح چھا گیا۔ زبیدہ کو لگا جیسے وہ ساری کی ساری آگ اور کسی سیال مادے کی بن کر رہ گئی ہے اور اسی بے خود لمحے میں سجاد نے اسے اتنا بھینچا کہ اس کا سانس بند ہو گیا اور سینہ دھونکنی کی طرح چلنے لگا۔ زبیدہ نے کوئی خواب سمجھ کر آنکھیں زور سے بند کر لیں۔ اس کے سارے بدن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں تھیں۔ لگا جیسے دریا میں آیا سیلاب سارے بند توڑ کر اسی طرف بھاگا چلا آ رہا ہو۔ سجاد نے پے در پے اس کے گالوں، ہونٹوں، ماتھے پر بوسے ثبت کرنے شروع کر دیئے۔ زبیدہ نڈھال سی ہوتی چلی گئی۔ پھر اچانک کھٹکا ہوا اور وہ دونوں جدا ہو گئے۔

جوانی کا یہ پرلطف لمحہ اس نے یادوں کی ڈبیا میں ہمیشہ کے لیے قید کر کے محفوظ کر لیا تھا۔ وہ اسے کبھی بھلا نہ سکی تھی۔ کھٹکا اماں نے کیا تھا مگر اس نے ان دونوں میں سے کسی کو پتہ نہیں چلنے دیا کہ جذبات کا بھڑکتا الاؤ اور ان دونوں کی بے خودی کو وہ دیکھ چکی تھی۔

''ایسی وحشت! اماں زیر لب بڑبڑائیں اور اسی لمحے سوچ لیا کہ اب ان دونوں کو ایک دوسرے کا کر دینے کا بندوبست کر دینا چاہیے۔ دونوں گھرانوں میں محبت اور بے تکلفی تھی، لہٰذا باہمی رضامندی کے بعد ہفتوں میں ہی سجاد اور زبیدہ کی دھوم دھام سے منگنی کر دی گئی۔ خوب شادیانے بجے، مٹھائیاں بٹیں، ناچ گانا ہوا، خوشیاں منائی گئیں۔

''کون ہے بیٹا؟'' اماں نے عینک کے شیشے کو آنکھوں پر جماتے ہوئے غور سے دیکھا اور پھر فوراً ہی پہچان کی چیخ سی ماری۔

''سجاد..... تم؟ تم یہاں کہاں؟''

اماں نے زبیدہ کو بھاگ کر سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

''خالہ میں وہ امریکہ سے ڈاکٹروں کی ایک ٹیم کے ساتھ زلزلہ زدگان کے علاج کے لیے آیا ہوا ہوں۔ صبح ہسپتال میں زبیدہ نظر آ گئی تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ پتہ پوچھتا پچھاتا یہاں تک آ گیا۔''

''اچھا.....'' اماں نے مختصر جواب دے کر اس کی طرف بڑے غور سے دیکھا۔ خیال آیا یہ وہی تھا، جس کی بے وفائی کی وجہ سے میری زبیدہ آج تک تنہا ہے۔ ڈاکٹر بننے کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے امریکہ سدھار گیا۔ دس برس تک میری بچی اس کی

منگنی کی چنری اوڑھے خوشیوں کی آس لگائے بیٹھی انتظار کرتی رہی۔ پھر سجاد نے امریکہ میں کسی گوری سے شادی کرلی۔ اللہ اللہ خیر صلا۔

سجاد اپنی گوری بیوی اور دو بچے لے کر پاکستان آیا تو چند سال گزر چکے تھے۔ اس وقت تک زبیدہ اور اس کی اماں محلہ چھوڑ کر کسی دوسرے شہر کو جا چکے تھے۔ زبیدہ نے اس کی آمد کا سنا تو سجاد سے ملنے کو بے تاب ہوگئی اور اماں سے ضد کرنے لگی کہ بس ایک آخری بار مجھے اس سے ملوانے کے لیے لے جاؤ۔ اماں اس کی ضد کے آگے مجبور ہوگئی اور زبیدہ کو لے کر سجاد کے والدین کے گھر جا پہنچی۔ دونوں گھرانوں میں بہت پیار رہ چکا تھا، لہٰذا ان کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ ہر طریقے سے خاطر داری کی گئی۔ وقتِ رخصت زبیدہ اٹھی، اپنی منگنی کی انگوٹھی سجاد کے منہ پر دے ماری اور ''چل اماں'' کہہ کر دروازے سے باہر نکل گئی۔ اس کے بعد سے دونوں خاندانوں کا آپس میں کوئی رابطہ نہ رہا۔ نہ کبھی خیر خبر معلوم ہوئی اور اب اتنے برسوں کے بعد ڈاکٹر سجاد صاحب اماں کے سامنے کھڑے تھے۔ اس کے سر پر سرمئی بال بہت جچ رہے تھے۔

''کتنی محبت کرتی تھی میری پیاری بچی اس سے۔'' اماں نے ٹھنڈی سانس بھر کر سوچا اور پھر جھوٹ موٹ سجاد سے اس کے گھر والوں کی بابت پوچھنے لگی۔ کون کہاں ہے، کیا کر رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔ حالانکہ درحقیقت انھیں کسی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

''تمھاری بیوی بچے کیسے ہیں؟'' اماں نے دل کڑا کر کے پوچھ لیا۔ ''بیوی ہے یا چھوڑ دی۔''

''نہیں خالہ، خدا نہ کرے۔ بچے بڑے ہو گئے ہیں۔ بیوی اچھی ہے۔ اس سے تو وفا کرتا رہوں گا..... ایک بار کسی سے بے وفائی کی تھی، اس کا افسوس ہمیشہ رہا ہے۔''

''اچھا؟'' اماں نے ایسا کسیلا منہ بنایا جیسے منہ میں کڑوا بادام آ گیا ہو۔ ''بڑا آیا وفادار۔ بے وفائی کے لیے میری زبیدہ ہی رہ گئی تھی؟'' انھوں نے دل ہی دل میں اسے ایک بددعا دے کر اس کا جملہ دہرایا۔

''زوبی کی شادی ہوگئی؟'' سجاد نے ڈرتے ڈرتے سوال کر دیا۔

اماں نے کوئی جواب دینے کے بجائے زہر بھری نظروں سے گھورا تو سجاد نے نظریں جھکا لیں۔

''میں بہت شرمندہ ہوں خالہ جان۔ آپ سے اور زوبی سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ واپس جانے سے پہلے دل ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔''

''دل تو تمھارا ہرگز ہلکا نہیں ہوسکتا سجاد۔ تمھاری وجہ سے میری معصوم بچی کی زندگی برباد ہوئی۔ ہم کیسے بھول سکتے ہیں؟''

اماں نے اسے احساسِ جرم کے سمندر میں ڈوبنے کے لیے مزید اندر دھکیل دیا۔ ''میں جاؤں زوبی کے پاس..... اس سے مل لوں اگر آپ کی اجازت ہو؟'' سجاد نے اوپر کے کمرے سے آتی روشنی دیکھ کر پوچھا۔

''ٹھہرو پہلے میں اس سے پوچھ لوں۔ اسے تم پر بہت غصہ ہے۔ مجھے ڈر ہے کہیں تمہیں سیڑھیوں سے نیچے دھکا ہی نہ دے دے۔'' اماں نے اسے اور ڈرا دیا اور وہ سہم کر وہیں بیٹھے کا بیٹھا رہ گیا۔

اماں دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھتی اوپر کو چلیں۔ زبیدہ کے کمرے کے قریب پہنچ کر پل بھر کو ٹھٹک کر رہ گئیں۔ کمرے میں سے نور جہاں کے نغمے کی دھیمے سُروں میں آواز آ رہی تھی ''کبھی تم بھی ہم سے تھے آشنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو'' کمرے کی جھری میں سے نظر آنے والا منظر بھی کچھ عجیب و غریب تھا۔ زبیدہ اماں کی شادی کا سرخ جوڑا تن سے لگائے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے گنگا جل رواں تھا۔

''میری معصوم بچی۔'' اماں ہولے سے بڑبڑائیں اور کلیجہ تھام کر وہیں سیڑھیوں میں بیٹھ گئیں۔ ''ذلیل انسان۔ جی چاہتا ہے تجھے ایسی سزا دوں کہ.....'' وہ نیچے اتر آئیں۔

''زبیدہ کو صبح سکول جانا ہوتا ہے نا اسے جلدی سونے کی عادت ہے۔ وہ تو سو گئی۔'' اماں نے بہانہ بنا دیا۔

''تو پھر میں چلتا ہوں خالہ۔ ایک بار زوبی سے مل کر خود معافی مانگ لیتا تو..... دو دن بعد تو میری امریکہ روانگی ہے۔'' وہ ہچکچا کر بولا۔

اماں کچھ سوچ میں پڑ گئیں۔ چند لمحوں بعد بولیں۔ ''کل شام کو آنا بلکہ کھانا یہیں پر کھا لینا۔ تب تک میں کوشش کروں گی زبیدہ کا موڈ کچھ ٹھیک ہو جائے۔ اچانک تمہیں دیکھ لینے کا صدمہ بھی تو ہو رہا ہوگا۔'' اماں نے سمجھانے کے انداز میں کہا تو وہ سلام کر کے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''شام چھ بجے تک آ جانا۔ یہ پہاڑی علاقہ ہے۔ رات کو وادی میں سناٹا ہو جاتا ہے..... ایسا نہ ہو تم کہیں گم ہو جاؤ۔'' اماں بولیں۔

''نہیں مجھے ڈرائیور جیپ میں چھوڑ دے گا اور پھر لے جائے گا۔ میں ضرور آؤں گا خالہ جان۔ پھر خدا جانے زندگی میں کبھی دوبارہ ملنے کا موقع ملے نہ ملے۔'' سجاد خدا حافظ کہہ کر روانہ ہو گیا۔ جانے سے پہلے اس نے اوپر کے کمرے کی کھلی کھڑکی کے پٹ کی طرف دیکھا۔ اندھیرے کے باوجود اسے لگا کہ جیسے کوئی اسے جاتا دیکھ رہا ہے۔

اگلے روز زبیدہ وانٹیئر کام کرنے ہسپتال نہیں گئی۔ ایک دو فون آئے مگر اس نے خرابی طبیعت کا بہانہ بنا کر ٹال دیا۔ سجاد کو دیکھنے کے بعد اس کا جی چاہ رہا تھا کسی پہاڑ کی اندھی کھوہ میں جا کر چھپ جائے۔ یہ شخص اس کی واحد اکلوتی محبت تھا اور اسے مسترد کر کے کسی اور کے ساتھ سکھ کی زندگی گزار رہا تھا۔ اسے دیکھنے کی خوشی تو تھی مگر دھتکارے جانے کا غم اس سے کہیں بڑا تھا۔

ناشتہ کر کے اماں نے زبیدہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ''کتنی جھریاں پڑ گئی ہیں میری خوبصورت بیٹی کے گلاب چہرے پر۔'' ان کے دل سے ایک ہوک نکلی۔

''زبیدہ میری بچی۔ آج دل بہت پریشان ہے......'' انھوں نے اسے چائے کا کپ پکڑاتے ہوئے کہا۔

''اس منحوس کی وجہ سے نا...... میں بھی رات بھر نہیں سوئی۔'' زبیدہ جیسے پھٹ پڑی۔ ''کیوں بلا لیا ہے اسے آج پھر؟ میرے زخموں پر نمک چھڑکنے کو...... بڑا آیا معافی مانگنے والا۔ میں اسے ہرگز ہرگز معاف نہیں کرنے والی...... یہ اچھی رہی...... خود بیوی بچوں کے ساتھ مزے سے زندگی گزارو اور جن کو روند چکے ہو، ان سے معافی لے کر اپنے گلٹ (Guilt) کو ختم کر کے چلتے ہو...... واہ میں تو دعا کرتی ہوں کہ آتے ہوئے اس کی جیپ ہی الٹ جائے۔ پہاڑوں کی گہرائی میں جا گرے۔ بدبخت کہیں کا۔'' زبیدہ کی آنکھیں آگ اور پانی برسانے لگیں۔

''نہ میری بچی۔ ایسے نہیں کہتے۔ اللہ اس سے خود ہی انتقام لے گا۔ تو دیکھ لینا، فکر نہ کر...... میں تو کسی اور وجہ سے پریشان ہوں۔'' اماں نے اسے پیار سے پچکارتے ہوئے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

''اور کون سی وجہ ہے اماں؟ خیریت تو ہے؟'' زبیدہ کچھ پریشان سی دِکھنے لگی۔

''رات تیرے ابا خواب میں آئے تھے۔'' اماں نے بات شروع کی۔

''میری وجہ سے ہی آئے ہوں گے۔'' زبیدہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

''یقیناً ایسی ہی بات ہو گی مگر کہنے لگے میں پانی میں ڈوب رہا ہوں۔ کچھ کرو۔'' اماں نے دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب ہے؟ اماں تم کوئی نیاز وِیاز دلوا دو......'' زبیدہ نے تجویز پیش کی۔

''نہیں بیٹا۔ مجھے لگتا ہے ان کی قبر میں پانی آ گیا ہے اور وہ مجھے اس کی مرمت اور دیکھ بھال کے لیے کہہ رہے ہیں۔ تمھیں تو پتہ ہے خواہش کے باوجود میں ایک عرصے سے ان کی قبر کی مٹی چومنے نہیں جا سکی۔ تجھے اکیلا چھوڑ کر جانے کی ہمت جو نہیں ہوتی'' اماں ڈبڈبائی آنکھوں سے بولی۔ ''ہائے میرے پیارے شوہر کتنے اکیلے ہوں گے۔''

زبیدہ خاموش ہو گئی۔ پھر یکلخت بولی۔

''چلی جاؤ اماں۔ میں اکیلی ٹھیک رہوں گی۔ میری فکر نہ کرو۔''

''بیٹی بس حوصلہ ہی نہیں پڑتا۔ اوپر سے اب یہ مہمان بھی تو بلا لیا ہے۔ اسے کھانا کھلانے کا وعدہ کر بیٹھی ہوں مگر قبر مجھے آواز دے رہی ہے۔''

''خوامخواہ ہی بلا لیا تم نے۔ میں تو کہتی ہوں اس کی پلیٹ میں چٹکی بھر زہر ملا دیتے ہیں۔ اس نے جو ہماری بے عزتی کی ہے، اس کا بدلہ بھی تو لینا چاہیے۔'' زبیدہ غصے سے پھنکارنے لگی۔

''ارے میری بچی، تو فکر کیوں کرتی ہے۔ بدلہ ملے گا...... اسے ضرور ملے گا۔ حوصلہ کر، تو بس سب کچھ اللہ پر چھوڑ دے۔'' اماں

نے اسے تسلی دے کر سمجھانے کی کوشش کی اور خود شام کے کھانے کے انتظامات کا جائزہ لینے لگیں۔
شام کو سجاد تحفوں سے لدا پھندا گھر آیا۔ اماں نے بہت مزے کا کھانا بنایا اور خلاف توقع اس سے اچھے سلوک کا مظاہرہ کیا۔ زبیدہ بھی بت بنی چپ چاپ آس پاس پھرتی رہی۔ کبھی کبھار سجاد کی کوئی بات سن کر ایک خفیف سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھل جاتی تو وہ اسے جلدی سے چھپانے کی کوشش کرتی۔ دھیرے دھیرے دونوں میں زلزلے کے موضوع پر بات چیت اور تبادلہ خیال ہونے لگا۔ یکایک دروازے پر دستک ہوئی اور چوکیدار بابا اندر چلا آیا۔ اسے دیکھتے ہی اماں بولیں۔
''ہاں بس تم رکو، میں ابھی آتی ہوں۔'' اماں یکدم شال اوڑھتے، پرس ہاتھ میں جھلاتے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔
''آپ کہاں چل دیں اماں اس وقت؟'' زبیدہ حیرانگی سے بولی۔
''وہ میں نے صبح تجھے بتایا تو تھا تیرے ابا کی قبر ٹھیک کروانے جانا ہے۔ چوکیدار گاڑی لے کر آگیا ہے۔ ہم ابھی سیدھے ہی شہر کو نکل جائیں گے۔ صبح تک میں لوٹ آؤں گی۔'' اماں نے وضاحت کی۔
''مگر اماں...... اس وقت؟ مجھے اکیلا چھوڑ کر؟'' زبیدہ نے کچھ سمجھ میں نہ آنے کے انداز میں کہا۔
''اکیلی کیوں، یہ اپنا سجاد جو ہے۔ اس کے لیے مہمان خانے والا کمرہ میں نے صبح ہی صاف کروا دیا تھا۔ بھئی آرام سے جا کر سوئے اور صبح چلا جائے۔ ویسے بھی تم لوگ بچپن کے ساتھی ہو۔ باتیں واتیں کرو۔ مجھے تو یوں بھی رات آٹھ بجے ہی نیند آجاتی ہے۔'' اماں نے یوں آرام سے بات کی جیسے سجاد ان کے گھر کا آدمی ہو اور وہ روز وہاں آتا جاتا ہو۔
''کیوں سجاد بیٹا۔ ٹھیک ہے نا؟ ارے تمھارے خالو خواب میں آکر مجھے بلا رہے ہیں...... جانا تو پڑے گا...... اچھا ہوا تم آگئے۔ میں کل لوٹ آؤں گی۔ بس بیٹا میری طرف سے تمھیں خدا حافظ۔'' سجاد اور زبیدہ یوں بت بنے کھڑے رہے جیسے ان میں جان ہی نہ رہی ہو۔ انھیں جیسے سمجھ میں ہی نہ آیا کہ اس صورتحال کا کیا کریں۔
اسی لمحے بادل زور سے گرجے اور بجلی چمکنے لگی۔ اماں نے اپنی بڑھتی عمر کی خشک بنجر زندگی گزارنے والی بیٹی کی طرف دیکھا اور چادر اپنے گرد لپیٹتے ہوئے بولیں:
''لگتا ہے آج رات خوب بارش ہوگی۔ اچھا ہے درخت ہرے بھرے ہو جائیں گے۔ کب سے انتظار تھا مینہ برسنے کا۔ اچھا زوبی بیٹا دروازہ اچھا طرح اندر سے بند کر لینا اور ڈرنا نہیں...... سجاد جو ہے......'' اماں نے چوکیدار بابا کو اپنا سفری تھیلا تھما دیا اور گھر سے باہر آکر مسکرا دیں۔ ان کے لبوں سے نور جہاں کا ایک مقبول نغمہ پھوٹنے لگا......'''رم جھم رم جھم پڑے پھوار...... بڑا آیا وفادار۔''

☆☆☆☆☆

آخری تیر

جب وہ گھوڑے سے نیچے اُترا تو اس کی چال میں ایسا غرور تھا۔ جیسے زمین پر چلنا اس کے قدموں کیلئے مناسب نہیں ہے - وہ اپنی آنکھوں کو ہر اُس چیز سے بچائے چلا جا رہا تھا جو اس کے راستے میں آجاتی، انسان، بوڑھے، گھوڑے، بچے، عورتیں سیڑھیاں راستے دُکانوں کے بھرے ہوئے شوکیس، کسی پر بھی اسکی نظر ٹھہرتی نہیں تھی جیسے بے وقعت اور حقیر چیزیں دیکھنے سے اس کا جسم اور وجود کی پاکیزگی اور عظمت پر حرف آجائے گا وہ اپنی تلوار کے دستے میں لگے ہوئے ہیروں پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے ہیروں کی دُکان کی طرف بڑھے جا رہا تھا، اس کے انداز سب دیکھنے والوں کو احساس ہو چکا تھا کہ وہ روندنے کی نیت سے چل رہا تھا وہ تلوار کے دستے میں جڑے ہوئے ہیروں کو جو ڈھیلے ہو کر ہلنے لگے تھے مضبوطی سے کس کر دوبارہ اس طرح نصب کروانا چاہتا تھا کہ تلوار کی حرکت سے بھی ہلنے نہ پائیں۔ اس کے محافظ اور خادم اُس کے پیچھے چلے آرہے تھے جنہیں وہ اپنے سے آگے بڑھنے نہیں دے رہا تھا۔ ہیروں کی دُکان کے صحت مند اور لحیم شحیم آدمی نے اس کے لیے دروازہ کھولا تو اس نے اپنا دایاں ہاتھ اپنے کاندھے سے اُٹھا کر ہلایا۔ تو اس نے اس کے خادم اور محافظ دُکان کی سفید سیڑھیوں کے دائیں بائیں کھڑے ہو کر راہ چلتے مسافروں کو شک اور قہر سے گھورنے لگے۔

بوڑھا شاعر شراب خانے کی سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے رک گیا۔ پھر وہ اُسکی طرف آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔ شاعر کا خیال تھا کہ وہ اُسے پہچان لے گا۔ کیونکہ بادشاہ کے محل میں کئی تقریبات میں اُس نے اپنی نظمیں لکھ کر بادشاہ وقت سے خطاب اور انعامات حاصل کیے تھے۔ وہ بوئے دشت کے نام سے مشہور تھا۔ بادشاہ کے محل میں سب لوگ اُسے زمین پہ سب سے بڑا دانشور اور سب سے اچھا شاعر مانتے تھے۔ اس نے نظمیں لکھ لکھ کر بادشاہ کی فوج اور اس کے وفاداروں کے اندر فخر اور شجاعت کے جذبات اُبھار کر لوگوں کو لڑنے اور شہید ہو جانے کے لیے تیار کیا تھا۔ بوئے دشت کا خیال تھا۔ پرانا مجاہد سردار اُسے پہچان کر ضرور سے اُس سے گفتگو کرے گا، اور اس

کلیم خارجی

گفتگو کے نتیجے میں وہ اُس کی ایک اچھی سے نظم لکھ کر شہر کے قہوہ خانوں، سراؤں، شراب خانوں اور کھیل کے میدانوں میں اُسی لحن اور انداز سے پڑھے گا۔ جس کے لیے وہ مشہور اور معزز سمجھا جاتا تھا۔ بوڑھا بوئے دشت جب شوق اور جوش کی حالت میں ہیروں کی دُکان کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ تو سیڑھیوں پہ کھڑے محافظوں اور خادموں نے اُسے سختی سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ تم دُکان کے اندر نہیں جا سکتے کیونکہ اس وقت شاہی فوج کا ایک عظیم سپاہی ابوشجاع اندر موجود ہے۔

لیکن میں بادشاہ کے محل کا اعزاز یافتہ شاعر بوئے دشت ہوں۔ اور ابوشجاع کو اچھی طرح جانتا ہوں میں صرف اس سے ہاتھ ملانا چاہتا ہوں۔ تم جو کوئی بھی ہو۔ ابوشجاع کے قریب نہیں جا سکتے بہتر ہوگا کہ تم یہاں سے دفع ہو کر۔ دور کہیں سے ابوشجاع کو دیکھ کر اپنی عقیدت کا تقاضا پورا کرلو۔ چلو ہٹو۔ بوئے دشت اس قسم کے لہجے سے ناواقف تھا۔ وہ لرز گیا۔ حیرت اور شرمندگی سے اس نے آس پاس دیکھا۔ اور جلدی سے شراب خانے کی طرف چلنے لگا۔ شراب خانے کی سیڑھیوں پہ بیٹھ کر وہ اپنے حواس قابو میں رکھ کر خود یوں حوصلہ دینے لگا۔ جیسے کسی نے اسکی خمیدہ کمر پہ کس کے لات دے ماری ہو۔ وہ کسی گھائل گھوڑے کی طرح ہانپ رہا تھا۔ کہ اس کے قریب کھڑے ایک صحت مند نوجوان خلوص سے ڈانٹتے ہوئے بولا، بزرگو اب آپ چند ایسے مشاغل اپنائیں جو آپ کی عمر اور طاقت کے مطابق ہوں۔ یہ اونچی نیچی سڑکیں اور سیڑھیاں اب آپ کے پیروں کے مطابق نہیں رہیں۔

اس نے جھینپ کر نوجوان کو گھورا۔ اور اپنی کیفیت چھپاتے ہوئے بولا۔ اصل میں آج ابوشجاع سے ملنا تھا۔ وہ میرا پرانا یار آشنا ہے۔ میں بوئے دشت ہوں۔ لیکن وہ جو ہیروں کی دُکان کی سیڑھیاں ہیں نا۔ بہت چکنی اونچی اور دشوار ہیں۔ میں نے کوشش کی لیکن چلو۔ عمر پھر کبھی مل لوں گا۔

گفتگو کے بعد بوئے دشت اس خیال سے چپ ہو گیا کہ اجنبی نوجوان اُسے اکیلا چھوڑ کر چلا جائے۔ لیکن نوجوان کی حرکات سے اندازہ ہو رہا تھا۔ کہ وہ کسی خاص مقصد کے تحت شراب خانے کی سیڑھیوں سے ہٹنے والا نہیں۔ بوئے دشت کو ابوشجاع کے باہر نکلنے کا انتظار بھی تھا تاکہ اُسے گھوڑے پہ سوار اپنے قریب سے گزرتے ہوئے عقیدت اور آشنائی کے اظہار میں ہاتھ ہلا کر دیکھنے والوں کو یہ باور کرالے کہ بوڑھا ہونے کے باوجود بادشاہ کے خاص لوگوں کے ساتھ اس کے تعلقات قائم ہیں۔ لیکن نوجوان ٹس سے مس نہ ہوا تو بوئے دشت ملامت کرتے ہوئے بولا۔ ہمیں سیڑھیوں سے ہٹ جانا چاہیے۔ ہم نے آنے جانے والوں کا راستہ روک رکھا ہے، نوجوان نے اس کی بات ان سنی کرکے شراب خانے کی

تیسری منزل کی کھلی کھڑکی میں یوں دیکھا جیسے کوئی حسینہ اسے اشارہ کر رہی ہو۔ بوئے دشت سے یہ سب برداشت نہ ہوا۔ وہ براہ راست نوجوان سے مخاطب ہوتے بولا تم پہ عقل اور احساس کی بات اثر نہیں کرتی۔ تم اپنے باپ کے انتقال کے بہت سالوں بعد، سوروں کے باڑے میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ کہہ کر وہ اس کا ردعمل دیکھے بغیر جھٹ سے شراب خانے کے دوازہ کھول کر اندر جا گھسا۔ ایک کونے میں خالی میز پہ جا کر اُس نے شراب خانے کے کم سن خادم کو آواز دے کر اپنے قریب بلایا۔ اور سسکتے ہوئے بولا، سنہری والی لے کر آؤ۔ اور مجھ پہ انڈیل دو۔ خادم حیرت سے گھورتے ہوئے بولا۔ میرے بزرگ آج شاید آپ نے لال والی زیادہ پی لی ہے، اس کا اثر تو کم ہو لینے دو، نوجوان خادم کی بات سن کر بوئے دشت آپے سے باہر ہو گیا۔ اور چیختے ہوئے بولا میں بوڑھا ضرور ہوں لیکن کمزور اور نامرد نہیں ہوں۔ تمہیں شاید میری مردانگی دیکھنے کی تمنا تڑپا رہی ہے۔ اگرچہ میں نے یہ کام چھوڑ دیئے ہیں۔ لیکن میں تمہیں نہا ل کر سکتا ہوں۔ نوجوان خادم کھسیانا ہو کر شراب خانے کے بڑے کاؤنٹر کے پیچھے جا کر چھپ کے بیٹھ گیا۔ اس دوران سیڑھیوں پہ کھڑا نوجوان بھی شراب خانے کے اندر داخل ہو گیا۔ اور وہ سیدھا اس میز کی طرف جا بیٹھا جہاں بوئے دشت تلملاتے ہوئے ہیٹھا ہانپ رہا تھا۔ نوجوان بے تکلفی سے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا، تمہارا چہیتا اور مغرور ہیرو اپنے خادموں کی حفاظت میں جا چکا ہے۔ حیرت یہ ہے کہ وہ اپنے آدمیوں کی مدد کے بغیر گھوڑے پہ بیٹھ نہیں سکتا۔ ایسے لوگ اکثر گھوڑے کی پیٹھ پہ گر کے جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ بوڑھے بوئے دشت نے اُسے دلچسپی سے گھورا۔ اور کچھ کہے بغیر شراب خانے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ وہ تیزی سے ہیروں کی دکان کی جانب بڑھ رہا تھا۔ دروازہ کھلتے وہ جھٹ سے یوں اندر گھسا۔ جیسے بہت بڑا سودا کرنے آیا ہو۔ وہ سیدھا دُکان کے مالک کے قریب گیا۔ جو دبلا پتلا گلابی رنگت کا آدمی تھا اسکی لمبی پتلی اور مضبوط انگلیاں اسکی مہارت اور تجربے کی وجہ سے پوروں سے ٹیڑھی میڑھی ہو چکی تھیں۔ وہ بوئے دشت کو جانتا تھا اس نے خیر مقدمی جملوں سے بوئے دشت کو اپنے سامنے نشست پہ بیٹھنے کے لیے کہا۔ نشست پر بیٹھتے ہوئے بوئے دشت عاجزی سے کھانستے ہوئے بولا۔ تم تو جانتے کہ میری تلوار اور ہیروں سے کبھی کوئی غرض نہیں رہی۔ میں تو دراصل ابوشجاع جیسے بہادر سپوتوں کا دیوانہ ہوں۔ مجھے پتہ چلا کہ وہ یہاں آرہا ہے۔ سو میں اُس سے ملنے چلا آیا۔ کیا وہ ابھی تک نہیں پہنچا اپنے جھوٹ میں اعتماد پیدا کرتے ہوئے بوئے دشت نے دُکان کا یوں جائزہ لیا۔ جیسے ابوشجاع دکان کے اندرونی دروازوں سے باہر نکل آئے گا۔ دکان کے مالک نے نے اپنی گھنی اور بھنویں سکیڑتے

ہوئے کہا۔ بوئے دشت کو گھورتے ہوئے کہا، بہادر سپوت اور تم اس کے دیوانے ہو؟ یہ کیا کہہ رہے ہو۔۔؟

بوئے دشت کو اپنے جھوٹ کے ظاہر نہ ہونے کی خوشی ہو رہی تھی وہ اپنے لہجے میں شیخی بھگارتے ہوئے بولا، بے شک مجھے ابوشجاع جیسے مرد شجاعت سے عقیدت ہے۔ اس نے بہت سے جنگیں لڑیں کئی فتوحات میں شامل رہا۔ وہ میرا تہوار اور اس زمین کا ایک عظیم ہیرو ہے۔۔۔ اور۔

"بوئے دشت": دکان کے ماہر اور ادھیر عمر تاجر نے غم اور غصے سے چیختے ہوئے ہلکی سی آہ بھرتے ہوئے میں تمہیں بہت دانشمند سچا اور کھرا شاعر سا سمجھتا تھا۔ لیکن تم نرے درباری نکلے۔ بوئے دشت دکان کے مالک کا احتجاجی رویہ دیکھتا رہ گیا خاموشی اور شرمندگی سے اسکی آنکھیں تھوڑی دیر کے لیے بند ہو کر دوبارہ کھلیں۔ تو دکان کا مالک بولا۔ تمہارے ہیرو نے کبھی کوئی بہادری کا کارنامہ انجام دیا ہے نہ وہ کوئی جنگ لڑا ہے۔ اُسے کسی نے لڑتے اور تلوار چلاتے نہیں دیکھا۔ اسکی شجاعت اور بہادری کے قصے سنانے والے لوگ اس کے خاندان کے افراد، اسکے پالے ہوئے خوشامدی اور لالچی افراد ہیں، وہ تھوڑی دیر رُکا، اور پھر اس نے ایک نوکر سے کہا، ذرا ابوشجاع کی تلوار لے کر آؤ۔ اس تلوار کو غور سے دیکھو۔ میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ تلوار گزشتہ دو دہائیوں سے استعمال نہیں ہوئی۔ اس کی دھار شراب کے پیالے کے کناروں کی طرح نرم اور موٹی ہے۔ میرا خیال اسکی دھار کبھی تھی ہی نہیں۔ سو تمہارے ہیرو نے آج تک کسی دشمن کی گردن نہیں کاٹی۔ یہ جنگ کے دنوں میں خیموں کے اندر چھپ کر شغل میلہ کرتا رہا ہے۔

بہادری اور دلیری وہ ہوتی ہے جسکا ذکر دشمنوں کی زبان سے ادا ہو۔ میرے پاس دشمنوں کے جاسوس بھی آتے ہیں۔ دکان کے مالک نے رازداری سے اپنی آواز دھیمی کرتے ہوئے کہا۔ آج تک کسی نے اسکی بہادری کا کوئی واقعہ نہیں سنایا۔ وہ اُسے بادشاہ کا خاص محافظ اور سپاہی سمجھتے ہیں۔

میں تم سے ایسی حقیر باتیں سننے کے لیے نہیں آیا تھا۔ بوئے دشت ملامت کرتے ہوئے بولا تم اس کے بارے میں وہ جانتے ہو جو تمہیں بتایا گیا ہے۔ دکاندار اُسے سمجھاتے ہوئے اعتماد سے بولا، اور اس کے بارے میں بولنے والے لوگ شاہی عبادت خانے کے پیشوا اور واعظ ہیں۔ یا شاہی گھوڑوں کے سائیس وغیرہ ہیں۔ بوئے دشت آنکھیں کھولو اس عمر میں سچائی سے تمہیں طاقت ملے گی۔ سچائی جانتے رہو۔ تو تمہارا مطلب یہ ہے کہ ابوشجاع میں شجاعت کا کوئی وصف نہیں ہے۔ بوئے دشت مائل ہوتے ہوئے بے تکلفی سے بولا، میرے بزرگ کا عمر تم جیسے لوگ جو الفاظ کا بہترین چناؤ جانتے ہیں۔ جو زندگی اور دُنیا کا بہت سا علم اور تجربہ حاصل کر لیتے ہیں اُنہیں جھوٹے

بہادروں کے کارناموں پہ قصیدے لکھ کر جہالت اور پسماندگی کے لیے راہ ہموار نہیں کرنی چاہیے۔ یہی تو تمہاری عمر ہے۔ جب تم آنے والی نسلوں کے لیے اعلیٰ انسانی اور اخلاقی اقدار کی مثالیں پیش کر سکو۔

تمہیں کتنی سنجیدہ اور مدلل گفتگو کا فن آتا ہے، بوئے دشت اسکی باتوں سے متاثر ہو کر بولا، میرا خیال تھا کہ تم محض ایک تاجر اور کاریگر ہو۔ اور تمہارا صرف بہادروں اور سرکاروں سے واسطہ رہتا ہے جو صرف خوشامد کے عادی ہوتے ہیں میرا کسی سے کوئی خاص واسطہ نہیں ہوتا۔ کاریگر تلخ ہوتے ہوئے بولا، واسطہ امن کا ہوتا ہے۔ جو میرے پاس یہاں آتے ہیں۔ میں اپنی محنت اور مہارت کا معاوضہ لیتا ہوں میرے بغیر ان کے ہتھیار تیز، کارآمد اور زعب دار نہیں ہو پاتے۔ سمجھے---

بوئے دشت شرمندگی سے خاموش ہو کر میز پہ انگلیاں بجانے لگا۔ اور پھر دوستانہ انداز میں بولا، میں نے تو ابوشجاع پر ڈھیروں نظمیں لکھیں تھیں۔ اور کچھ تو اب بھی میرے پاس ہونگی۔ اس نے اپنے کاندھے سے لٹکے ہوئے تھیلے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا، رہنے دو تاجر تڑپ کر بولا، مجھے ایسے بہادر کے بارے میں کچھ نہ بتانا، جس نے صرف بہادر ہونے کا مظاہرہ کر رکھا ہو۔ بوئے دشت تمہارا ممدوح بادشاہ کے محل میں کنیزیں اور لونڈیاں پیش کرنے کے کام پہ مامور تھا۔ اور اب بھی ہے اس نے صرف بادشاہ کے محل اور دربار میں اپنا مقام حاصل کیا ہے - وہ تمام طاقتور وزیروں، مصاحبوں اور کمانڈروں کی خواب گاہوں میں عیش وعشرت کا سامان فراہم کرتا رہتا ہے۔ میں نے تمہیں ذرا آسان کر کے بات سمجھا دی ہے۔ تاجر کا لہجہ پہلے سے زیادہ تلخ اور سخت ہو گیا تھا۔ وہ بوئے دشت کی حالت دیکھ کر چپ ہو گیا۔ اور ابوشجاع کی تلوار پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے نرمی سے بولا۔ بوئے دشت مجھے ذرا غصہ آ گیا تھا لیکن تمہارے ابوشجاع جیسے لوگ اندر سے نابینا ہو جاتے ہیں دیکھو نا، تمہارا بہادر مجاہد اس تلوار کے دستے میں جڑے ہوئے ہیروں پہ بڑا نازاں تھا۔ لیکن اس کے تلوار کے دستے میں ستر جعلی موتیوں میں سے صرف ایک چھوٹا سا ہیرہ اصلی تھا باقی سب کھوٹے اور بے وقعت تھے۔ اسی لیے میں نے سارے موتی اسکے سامنے نکال کر اس کے حوالے کیے۔ تاکہ وہ تین دن بعد دوبارہ آئے تو میں اسکے نئے دستے میں دوبارہ اس کا وہ کھوٹا مال جڑ دوں۔ جس کے لیے اسکی گردن میں اکڑ اور پاؤں میں مدہوش سورماؤں جیسا غرور ہے۔

تو کیا اس کی تلوار کے دستے میں سب موتی کھوٹے ہیں، بوئے دشت حیران ہو کر اُٹھتے ہوئے بولا تاجر نے اس کے کندے پہ ہاتھ رکھتے کر اُسے بٹھاتے ہوئے بولا۔ ہوش عقل اور حوصلے سے کام لو۔ تم یوں حیران اور پریشان ہو رہے ہو۔ جیسے میں تمہارے پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچ رہا

ہوں۔ حالانکہ ابھی تم نے مجھ سے پوری باتیں نہیں سنیں۔

تم نے واقعی مجھے ہلکان کر کے رکھ دیا ہے۔ بوڑے دشت لمبی آہ بھرتے ہوئے بولا۔ میں ان واقعات اور قصوں پہ شرمندہ ہو رہا ہوں، جن میں ابوشجاع نے دشمنوں پر یلغار کر کے ان کے دستوں کے دستے قتل کروا ڈالے تھے، اس نے کالی پہاڑی فتح کر لی تھی دریائے سنگ دار کی پوری وادی اس کے نام سے منسوب ہو چکی ہے، بوڑے دشت نے ہاتھ کی مٹھی بنا کر پیشانی ٹھونکنا شروع کر دی۔

تاجر نے بوڑے دشت کو قائل ہوتے دیکھ کر کہا، آج تمہیں تلخ حقیقتوں سے آگاہ کرنے پہ تیار ہو چکا ہوں۔ جس طرح تمہارا بہادر ہیرو اپنی تلوار کے دستے میں نصب ہیروں کی اصلیت سے ناواقف وجاہل ہے، اسی طرح اُسے یہ بھی نہیں پتہ کہ اسکے بچوں میں کتنے اس کے اپنے ہیں اور اس کی منکوحہ اور غیر منکوحہ کتنی عورتیں اسکی وفادار اور اس کے اپنے بچوں کی مائیں ہیں۔

بوڑے دشت کی ہنسی چھوٹ پڑی اس کے نتھنے پھیل گئے۔ اور وہ کھانستے ہوئے بولا تم نے میری ساری زندگی کی کارکردگی گندے نالے میں پھینک دی۔ اصل میں کمینے اور دغا باز بادشاہ جب کسی نیچ اور چھوٹے آدمی کو بڑا بناتے ہیں تو وہ اسکی روح، ضمیر اور زندگی کی دھجیاں ادھیڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ تم دیکھ لینا وہ اچانک مرے گا۔ یا پاگل ہو کر بدصورتی اور غلاظت میں جان دے گا۔ ابھی اس کا یہ حال ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ زمین، دولت، اختیار عزت اور جاگیریں جو کچھ بھی اس کے پاس ہے۔ وہ سب اس نے خود کمایا ہے وہ اُسے محنت اور نام نہاد فتوحات کی قیمت اور صلہ سمجھ کر زمین اور اس پر موجود مجھ جیسے اور تم جیسے سینکڑوں لوگوں کے منہ پہ تھوکنے کے لیے تیار ہے۔ وہ تمام لوگ جو اس کے جھوٹے کارنامے سن کر اسکی عزت کرتے ہیں وہ انہیں ٹھوکر پہ رکھتا ہے تاکہ خود کو محفوظ و مقبول بنائے رکھے۔

میں آج گھر جا کر ان تمام نظموں کو دوبارہ دیکھوں گا۔ شاید میں انہیں جلا ڈالوں بوڑے دشت افسوس کرتے ہوئے بولا۔ لیکن ان نظموں کی وجہ سے مجھے بھی تو بہت کچھ ملا تو کیا سب غارت ہو کر رہ گیا۔۔۔۔

تاجر کو بوڑے دشت پہ رحم آنے لگا۔ اس نے شفقت اور خلوص سے لہجہ بدلتے ہوئے کہا میں نے تمہیں ہلکان کیے رکھا۔ لہٰذا اب تم جاؤ گے نہیں دوپہر کا کھانا کھا کر جاؤ گے۔ میری بیوی نے مچھلیاں تل کر بھیج رکھی ہیں۔

تمہارا بہت شکریہ۔۔ بوڑے دشت اٹھتے ہوئے بولا۔ اصل میں میرے منہ کا ذائقہ ٹھیک نہیں رہا۔ اور پیٹ یوں بھرا بھرا سا لگتا ہے جیسے میں نے کوئی حرام چیز کھائی ہے۔ میں چلتا ہوں۔۔۔

میرا تم سے کوئی جھگڑا نہیں، تاجر ہمدردی سے بولا، تمہارے دل کے اندر جو اندھی عقیدت تھی۔ اس کی وجہ سے مجھے بہت تکلیف ہوئی

تھی۔ تمہارا بہادر مجاہد ابوشجاع چار دن بعد صبح نو بجے تک پھر آئے گا۔ تاجر نے اُسے اعتماد میں لیتے ہوئے کہا۔ تم چاہو تو اُس سے پہلے میری دکان میں آجانا۔ تم نے یقیناً اس کو کبھی قریب سے نہیں دیکھا ہوگا۔ میں تمہیں یہ موقع فراہم کرتا ہوں کیونکہ وہ اپنے جعلی ہیروں کو اپنے سامنے تلوار کے نئے دستے میں جڑتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہے۔

چار دن بعد بوئے دشت جب ہیروں کی دُکان کی طرف بڑھنے لگا تو اس نے دکان کی سیڑھیوں کے پاس ابوشجاع کے گھوڑوں اور محافظوں کو پہچان لیا۔ افسوس اور شکستگی کی وجہ سے اُسکے منہ سے ایک آہ نکلی۔ اور اسکا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ جان چکا تھا کہ محافظ اُسے اندر جانے نہیں دیں گے وہ اچھا موقع گنوا چکا ہے۔ وہ اپنے سے بولا، میں تو مقررہ وقت سے بہت پہلے آچکا ہوں شاید ابوشجاع کسی منصوبے کے تحت بہت جلد آگیا ہے۔ بوئے دشت نے پچھتاوے کے ساتھ گردن ہلائی اور شراب خانے کی طرف بڑھنے لگا۔ شراب خانے کی سیڑھیوں پہ اُسے وہی صحت مند اور کڑیل جوان بیٹھے ہوئے نظر آیا۔ جو چار دن پہلے اُس سے مل چکا تھا بوئے دشت نے اُس ناگواری سے دیکھا۔ اور جلدی سے شراب خانے میں داخل ہوگیا میز پر بیٹھتے ہوئے بوئے دشت نے اپنی بیاض نکالی۔ وہ اپنی لکھی ہوئی نظموں سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ بیاض کھول کر غور سے ایک ایک صفحہ پڑھتا رہا۔ اُسکی آنکھوں میں نمی اور چہرے پہ مسکراہٹ دیکھ کر شراب خانے کے تمام خادم اُس کا تماشہ کر کے چپکے چپکے ہنسے جاتے تھے۔ کہ اچانک لوگوں کے شور اور گھوڑوں کے بھاگنے کی آوازوں نے سب کو چونکا دیا۔ گھبرا کے سب باہر نکلے، ہیروں کی دکان کی جانب لوگ ڈرتے ڈرتے بڑھے چلے جارہے تھے۔ وہاں سیڑھیوں پہ شاہی لباس میں کوئی سردار خون میں لت پت مردہ پڑا تھا۔ ابوشجاع کے سب محافظ اور گھوڑے غائب ہو چکے تھے بوئے دشت تیزی سے دکان کی طرف لپکا۔ اس نے ابوشجاع کا کھلا ہوا، خشک منہ دیکھا اسکی بائیں کنپٹی پہ آہنی تیر اس طرح پیوست تھا کہ دوسری طرف سے اسکی نوک نکلی ہوئی دکھائی دے رہی تھی، سب پہچان چکے تھے کہ یہ بہادر سپوت اور وطن کا سب سے بڑا ہیرو ابوشجاع تھا بوئے دشت ہمت کر کے لوگوں میں سے رستہ بناتے ہوئے ابوشجاع کے مردہ جسم کے قریب پہنچ گیا۔ وہ اس کے پورے جسم کا یوں جائزہ لینے لگا جیسے اس کا علاج کرنے کا ارادہ رکھتا ہو پیروں کا تاجر بھی دروازہ کھولے باہر سیڑھیوں کے زینے پہ کھڑا تھا وہ صرف اور صرف بوئے دشت کو دلچسپی سے گھورے جارہا تھا جبکہ بوئے دشت کا نچلا ہونٹ لٹک کر تھرانے لگا تھا۔ وہ ابوشجاع کے پیلے اور بے داغ چہرہ، اس کے ہاتھوں کی نرم اور سفید جلد، اسکی ابھری ہوئی توند کو ٹکٹکی باندھے دیکھے جارہا تھا اس کا جسم تو محل کے خواجہ سراؤں سے

ملتا ہے، بوڑے دشت بڑبڑایا۔ اپنی اس حرکت پر وہ خوفزدہ ہو گیا اور جلدی سے تاجر کے قریب جا پہنچا۔ تاجر کے چہرے پہ ایک نادیدہ سی مسکراہٹ دیکھ کر بوڑے دشت آہ بھرتے ہوئے بولا میں شراب خانے جا رہا ہوں، شاید آج مجھے زیادہ پینی پڑے گی۔ یہ کہہ کر وہ لرزتا ہوا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا شراب خانے میں جا گھسا جب وہ اپنی مخصوص میز کی طرف بڑھ رہا تھا تو اس نے وہاں وہی پراسرار سا جوان بیٹھا نظر آیا۔ اس نے بوڑے دشت کو دیکھتے ہی کہا۔ میرے بزرگ مجھے بہت افسوس ہوا۔ میں تمہارے غم میں برابر کا شریک ہوں کہ تمہاری زمین کا بہادر بیٹا اور تمہارے وطن کا ہیرو آج اس ناگہانی موت کا شکار ہو گیا۔ آؤ ہم دونوں اس کا سوگ منائیں اسکی باتیں سن کر بوڑے دشت اس کے سامنے بیٹھ گیا اس کی آنکھیں ایک مقام پہ ٹھہر نہیں رہی تھیں۔ اس کا جسم ابھی تک لرز رہا تھا۔ نوجوان نے اُٹھ کر اس کا کندھا پکڑ لیا اور ہمدردی سے بولا، یہ جگہ مناسب نہیں لگتی۔ چلو آؤ ہم شراب خانے کی تیسری منزل پہ چلتے ہیں۔ جہاں خاموشی سکون اور رازداری ہے۔ نوجوان نے بوڑے دشت کو اپنے مضبوط ہاتھوں سے سہارا دیتے ہوئے سیڑھیوں پہ چڑھایا۔ اور ہمدردی اور حوصلے کے الفاظ دہراتا ہوا اُسے تیسری منزل پہ لے گیا۔ بوڑے دشت کو بہت زیادہ حیرانی ہوئی۔ وہ ہانپتے ہوئے بولا، میں اتنے برسوں سے اس شراب خانے میں آتا جاتا رہا۔ لیکن کبھی تیسری منزل کے اس ہال میں نہیں آیا۔ اور نہ ہی مجھے کبھی کسی نے یہاں آنے کی دعوت دی۔ کمال ہے بوڑے دشت ہال کی دیواروں پہ دوشیزاؤں کی نیم عریاں تصویریں دیکھنے لگا۔ ہال کی بڑی کھڑکیاں اُسے حیران کیے جا رہی تھیں۔ ایک کھڑکی سے جھانکتے ہوئے وہ چیخا، حیرت پورا شہر یہاں سے نظر آتا ہے۔ یہاں سے ہم نظر آئے بغیر کتنا کچھ دیکھ سکتے ہیں۔ اُف کمال ہے، حیرت ہے، سکون، خاموشی اور رنگینی۔۔۔ بوڑے دشت کی کیفیت بدلنے لگی تھی۔

یہ تیسری منزل خاص لوگوں کی ہے، میرے بزرگ، نوجوان کی ایک بڑی الماری کی طرف بڑھتے ہوئے بولا یہاں شاہی فوج کے افسر، ان کے بیٹے اور خاص مصاحب آ کر بیٹھتے ہیں۔ اس کا خفیہ دروازہ پچھلی طرف شفاخانے کے پہلو میں ہے۔ بوڑے دشت کھڑکی سے جھانکنے کے بعد جب میز کی طرف بڑھا۔ تو نوجوان نے ایک سیاہ رنگ کی آہنی کمان میز پر رکھی ہوئی تھی۔ میز پر شراب کی بوتلیں اور دو گلاس بھی موجود تھے۔

تم اس شراب خانے کے بارے میں کتنا زیادہ جانتے ہوئے نوجوان کو گلاس میں شراب انڈیلتے دیکھ کر بوڑے دشت کے چہرے پہ خوشی اور دوستی کی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے ایک دوبار میز کے ایک سرے پہ بڑی سے خوفناک اور مضبوط سے کمان تو دیکھ لی تھی۔ لیکن اس کا ذہن اسکی

طرف سوچنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ نوجوان نے شراب کا گلاس بوڑھے بوئے دشت کی طرف بے تکلفی سے بڑھاتے ہوئے کہا، جوان ہوتے ہوئے بوڑھے کی نئی توانائی اور اُمیدوں کے نام، بوڑھے بوئے دشت نے قہقہے لگاتے ہوئے دو بڑے گھونٹ لیے۔ اور گلاس میز پر رکھتے ہوئے احسان مندی سے کہا، پھلو، پھولو، دودھ دنہاؤ نوجوان نے اپنا گلاس میز پر رکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ اے میرے معتبر بزرگ کیا تم جانتے ہو کہ ہمارے ملک کے پرانے دشمنوں کے ساتھ ہماری صلح ہوگئی ہے۔

نہیں نہیں یہ ناممکن ہے۔ بوئے دشت شراب کی تلخی کو لہجے میں ملاتے ہوئے بولا ان کے سروں پہ ہماری نسلوں کے قتل کا بوجھ ہے۔ انہوں نے برسوں ہمارے خلاف سازشیں کیں۔ ہمارے ہاں بھوک، غربت اور یتیمی کو بڑھایا۔ یہ انتقام ٹھنڈا ہونے والا نہیں۔ اُنہوں نے ہمارے خداؤں اور سورماؤں کا ٹھٹھہ اُڑائے رکھا۔ ٹھیک ہے لیکن یہ سب اب جاہلانہ ماضی کی داستانیں لگتی ہیں۔ نوجوان نے اپنا گلاس اُٹھاتا ایک گھونٹ لیتے ہوئے کہا، دشمن اب دشمن نہیں رہا۔ اس نے ہمارے خشک ہوتے دریاؤں میں اپنے دریاؤں کا پانی بہادیا ہے، ہماری شاہی فوج کے افسروں نے ان کی بیٹوں سے شادی کرلی ہیں۔ ہمارے ہاں کے تمام گورنروں، اور وزیروں اور کمانڈروں کے رشتے لگے ہوگئے ہیں۔ ہماری درسگاہوں، شفاخانوں اور شاہراؤں کے پرانے نام منسوخ کرکے ہمارے نئے بھائیوں کے بزرگوں سورماؤں اور دانشوروں کے ناموں سے منسوب کردیئے گئے ہیں۔ ہم نے اپنے مجاہدوں اور شہیدوں کے مزاروں کو مٹی میں ہموار کردیا ہے اور ہمارے سارے جنگجو مجاہد نئے دریاؤں کے لیے زمین کھودنے پر جت گئے ہیں۔ اور نئی تاریخ کو اس طرح مرتب کیا جارہا ہے کہ دونوں ملکوں کی نئی نسلوں کو ایک دوسرے سے شرمندگی اور ذلت محسوس نہ ہو۔

یہ تم کیا بک بک رہے ہو، بوئے دشت چڑتے ہوئے بولا تم پہ اتنی جلدی نشہ طاری ہوجاتا ہے۔ نوجوان نے ہنستے ہوئے میز پہ رکھی ہوئی کمان ہاتھوں میں پکڑلی۔ اور اسکی تانت کو اپنی انگلیاں سے کھینچتے ہوئے بولا، اب چونکہ صلح ہوگئی۔ اس لیے بادشاہ نے مجھے اس کام پر لگایا کہ وہ تمام افراد جن کی وجہ سے صلح کے معاملات پہ زد پڑتی ہو۔ انہیں ٹھکانے لگادوں بوئے دشت اپنی میچی ہوئی آنکھیں کھول کر نوجوان کو گھورنے لگا ہے لیکن اس کے دونوں ہونٹ سختی سے بند ہوگئے تھے۔

نوجوان سنجیدگی اور اعتماد سے بولا بادشاہ نے مجھے بیس تیر دیئے تھے کہ میں ان بااثر ممتاز اور ڈھیٹ قسم کے محب وطن لوگوں کو ختم کردوں جو جنگلوں میں کوئی نہ کوئی کارنامہ سرانجام دیتے رہے ہیں۔ آج شاید یہ آخری تیر تھا۔ جو میں نے ابوشجاع کی کنپٹی

سے پار کیا۔ مجھے حکم تھا کہ تیرا ایسی جگہ پہ ماروں کہ اگر بچ جائے تو مرتے دم تک ذہنی اور جسمانی معذوری میں مبتلا رہے۔
کیا یہ تمہارا آخری تیر تھا، بوئے دشت کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا۔
ہاں شاید! میں نے اپنا کام مکمل کر لیا ہے میں نے تمام بااثر اور مشہور لوگ مار ڈالے جو اس زمین اور آئندہ والی نسلوں کے لیے خطرناک ہو سکتے تھے۔ کیا بادشاہ نے تمہیں میرے حصے کا کوئی تیر نہیں دیا تھا، بوئے دشت نشے میں سسکتے ہوئے بولا۔ نوجوان نے گلاس منہ سے لگا کر بوئے دشت کے سوال کوئی اہمیت نہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ابوشجاع اور دوسرے تمام شہیدوں اور مجاہدوں سے زیادہ کارنامہ تو میرا رہا ہے۔ میں نے بہادروں پہ نغمے اور نظمیں لکھیں۔ دشمنوں کی زمینوں کو پلید وحقیر اور ان کے سورماؤں کی تذلیل وتحقیر پہ شاعری کی بادشاہ نے مجھے اور میری خدمات نظر انداز کر دیں۔
نوجوان شراب کا گھونٹ نگل کر ہلکے سے مسکرایا لیکن وہ کسی بات کا جواب دیے بغیر بوئے دشت کی آنکھوں میں گلے، اور ملامت کو دیکھتا رہا۔
بادشاہ کو چاہیے تھا کہ کم از کم ایک تیر تو میرے لیے بھی دیدیتا۔ اور پھر میرا کتنا بڑا اعزاز ہوتا کہ وہ تمہیں مجھ پر تیر چلانے سے بھی باز رکھتا۔ بادشاہ کو عزت دینا بھی نہیں آتی۔ بوئے دشت نے شراب کا خالی گلاس دوبارہ بھرنے کے لیے نوجوان کو قریب کر دیا۔ نوجوان نے شراب انڈیلنے کے بعد اپنی آستینیں اوپر موڑ لیں۔ اور اپنے ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں کستے ہوئے مسکراتے ہوئے بولا۔ بادشاہ نے تمہارے حصے کا تیر دیا تھا۔ بوئے دشت نوجوان کی بات سن نہیں رہا تھا وہ اسکی مضبوط اور کسی ہوئی کلائیوں کو تعریفی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ نوجوان کی سفید اور مضبوط انگلیوں اور کلائیوں سے ابھری ہوئی سبز رگیں دیکھ کر وہ مسکرایا۔ اور مستی میں سر ہلاتے ہوئے بولا، میں تمہاری کلائیوں، ہاتھوں اور انگلیوں کی سفیدی، خوبصورتی اور مضبوطی پہ ایک نظم ضرور لکھوں گا۔ نوجوان نے بوئے دشت کی بات سنے بغیر قدرے زور سے کہا۔ بادشاہ نے تمہارے حصے کا تیر بھی مجھے دیا تھا۔
بوئے دشت کو یوں لگا جیسے اسکا لباس میں کوئی زہریلا سانپ گھس گیا۔ وہ چونک کر سہم گیا۔ اور سوالیہ چہرہ بنائے نوجوان کی طرف رحم طلب نظروں سے دیکھنے لگا لیکن جب میں نے تمہاری عمر، صحت اور بزرگی کو دیکھا تو میں نے اپنا فیصلہ بدل دیا نوجوان کی بات سن کر بوئے دشت نے دیر سے روکی ہوئی سانس بحال کی۔ جسم ڈھیلا چھوڑ کر اس نے آزاد ہونے والی قیدی کی طرح قہقہہ لگایا۔
نوجوان اپنی جگہ سے اُٹھ کر بوئے دشت کے قریب آیا۔ اس نے بوئے دشت کی بغل میں اپنی کلائی ڈال کر اُسے سیدھا کھڑا

کیا۔ اور پھر اُسے اپنے ساتھ ٹہلتے ہوئے کھڑکی کے قریب لے آیا۔ بوئے دشت نے کھڑکی سے آنے والی ٹھنڈی ہوا میں سانس لے کر پرسکون آہ بھری۔

نوجوان کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ اسکی مضبوط انگلیاں سخت ہوکر بوئے دشت کی طرف پھیل گئی اور وہ کمال سکون سے بولا میرے بزرگ میں ایک جنگجو ہوں ۔ تمہیں تیر مار کے ہلاک کرنا میری جوانی طاقت اور مہارت کی توہین تھا۔ تیر چلانے کا مزہ نہیں آتا جب تک کہ میں پوری قوت سے چلہ نہ کھینچ لوں۔ اس نے بوئے دشت کے گلے کو اپنے مضبوط ہاتھوں سے جکڑ لیا۔ اور اُسے ہوا میں لٹکاتے ہوئے بولا تمہارے کمزور بوڑھے اور نازک جسم میں میرے تیر کے لیے مناسب جگہ ہی نہ تھی۔ بادشاہ نے تمہارے بارے میں مجھے غلط کہہ رکھا تھا۔ وہ صرف تمہیں صفحہ ہستی مٹانا چاہتا تھا جبکہ میں تمہیں مناسب طریقے سے مارنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اُس نے ہوا میں جھولتے ہوئے بوئے دشت کو جھٹکے کے ساتھ کھڑکی سے باہر عبادت خانے والی سڑک پہ اُچھال پھینکا۔ اُس نے نہایت بے خوفی سے نیچے بے سُدھ پڑے بوئے دشت کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے بڑبڑایا ۔ حریص بادشاہوں کو کیا پتہ کہ کس کو کیسے اور کب مارنا چاہیے۔ بادشاہوں کو تو بس یہ علم ہوتا ہے کہ کس کے مرجانے سے ان کی بادشاہت کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ بوئے دشت کی آنکھیں کھلی رہ گئی تھی اور وہ حیرت اور خوف کے ساتھ کھڑکی پہ جمی ہوئی تھیں۔ لوگ اب اس کے گرد جمع ہونے لگے تھے۔ نوجوان کھڑکی سے پیچھے ہٹا۔ اس نے چمڑے کے لمبے لمبے بوٹ پہن رکھے تھے۔ ایک بوٹ میں ہاتھ ڈال کر اس نے ایک باریک سا سیاہ ڈیڑھ فٹ لمبا آہنی تیر نکالا۔ اُس نے اُسے چلے پہ رکھا اور پوری قوت سے کھینچ کر پیلے آسمان کی طرف دے مارا۔ پھر کمان پر لٹکاتے ہوئے وہ بے خوفی سے سیڑھیاں اُترتا ہوا شراب خانے سے باہر نکل گیا۔ اُس کے قدم ہیروں کے تاجر کی دُکان کی طرف بڑھ رہے اسکی جیب میں بادشاہ وقت کے دیئے ہوئے چند ہیرے تھے۔ اس کا دل مطمئن تھا کہ ہیرے اصلی ہوں گے۔ کیونکہ اُس نے چنے ہوئے لوگوں کو ٹھیک وقت پہ نہایت مناسب طریقے سے ہلاک کیا تھا۔ وہ اپنے کیے گئے کام کے صحیح معاوضے کی خوشی میں تاجر کے ساتھ دو گھونٹ شراب پینے کا خواہشمند تھا ۔ اس کے پیروں میں اتنی طاقت اور استحکام تھا کہ اُسے اپنا باقی وجود بہت ہلکا ہلکا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ جب تک بددیانت لوگوں کو دوسروں کی موت سے فائدہ اور آسانی ملتی رہیں گی اُس کو اصلی ہیروں کا معاوضہ ملتا رہے گا۔

☆☆☆☆☆

فرِشتے.....

فرشتوں کا گھر مشہور تھا سفید لبادوں میں عورتیں صبح شام کیا کرتیں والدین نہ جانے کب کے راہیٔ عدم ہوئے خاندان بھر میں کسی نے مڑ کر نہ دیکھا کہ پانچ بن بیاہی بہنیں بیٹھی گندمی سے زردی مائل ہوتی جا رہی ہیں شرافت لبوں پر چپک کر آرزوؤں کی قبر بن چکی ہے چہرے وضو کر کر کے رومانی سے روحانی ہو چکے ہیں۔ لباسوں کے رنگ شک بھری نظروں سے بچنے کے لیے پھیکے ہوتے جا رہے ہیں۔ کاجل کی لکیر محلے کی عورتوں کے ڈر سے اپنے خط میں سہمی ہوئی ہے۔

لڑکیاں شریف ہیں مگر جہیز ندارد کوئی عشق آنکھ مٹکے کا چانس ویسے ہی نہیں کہ کھڑکیاں دروازے میخوں سے ٹھونک دیئے گئے ہوئے ہیں پرائی نظریں اور گلی کے لوفر بھی ادھر کو نظر نہیں اُٹھاتے.....

وقت کی رفتار نے فرشتوں کی تعداد کو کم کر دیا تین چار پارئیاں اُٹھ گئیں شرافت قبروں میں اُتر گئی آخری دو بہنیں گزرتی جوانی اور آتے ادھیڑ پن کے دوراہے پر ہراساں کھڑی تھیں سامنے نوجوان بچیوں کی ڈولیاں اُٹھتیں اور ڈھولک کی تھاپ فرشتوں کے دِل توڑ دیا کرتی، مگر انسانوں کو کہاں رحم آتا ہے بڑی کم عمری میں سمجھ آ چکی تھی کہ ہم جس معاشرے میں پیدا ہو گئے ہیں بہت ہی دل توڑنے کا ماہر ہے.....

یہ تو خیرات کرتے ہمدردی جتاتے عیادت کرتے ایسے الفاظ ادا کرتا ہے کہ سات نسلیں سلگ اُٹھیں شریفوں کی کوئی زندگی نہیں سامنے سامنے چوتھے فرشتے کو ٹی بی ہوئی اور اُس کی چھوت چھات سے آخری فرشتہ بھی شکار ہوا ڈولیوں کے بجائے چارپائیاں اُٹھیں مکان خالی ہو گیا محلے داروں نے درود و سلام کی محفلیں کیں شرافت کو سراہا اور اس کی ہڈیوں کو گلنے سڑنے سے قبل حق شفا کے دعوے کر کے مکان اونے پونے اپنے نام کیا شرافت کو نہ اپنانے والا معاشرہ اینٹوں کے لیے مرمٹا تاوقتیکہ یہی اینٹیں اُن کی قبروں پر نہ جڑی گئیں۔

صوفیہ بیدار

دکھوں کی تجارت کرنے والے اس دوہرے معاشرتی کردار میں میری شخصیت کی تعمیر ہو رہی تھی، جس نے مردوں سے تو تنفر کیا اُن کی لالچی ماؤں اور بہنوں سے بھی بے زار کر دیا ٹٹولتی نظریں مانگتے ہوئے انداز تیکھے جملے بازاری انداز اور شادی کی سودے بازی نے باغی بنا دیا اوپر تلے کی دو بہنوں کی شادی پر والدہ تڑپ اُٹھیں کہ بڑی بیٹھی ہے سب سے خوش شکل اور سب سے کم عقل اپنی جوانی کو راکھ کر رہی ہے.....

رو دھو ماں باپ چپ کر گئے اور میں لیکچرار بھرتی ہو کر ملتان پوسٹ ہو گئی وہاں کی روحانی فضا سے فرشتوں والا گھر میرے اندر دوبارہ زندہ ہو گیا پانچ زندہ لاشیں اُن کی معصومیت خود کو شریف ثابت کرنے کی عمر گزیدہ خواہش مجھے باغی بناتی چلی گئی والدین بیمار ہوئے پھر بوڑھے آخری دیدار ہوئے مگر میری ہٹ نہ ٹوٹی کافی کما چکی تھی والدین سے بھی حصہ ملا تو اسلام آباد میں ڈیکوریٹ لگژری فلیٹ جدید گاڑی اور ڈرائیور اور عمدہ ڈیپوٹیشن پوسٹنگ کے ساتھ موجود تھی جم ایکسر سائز برانڈڈ ڈریسز نے بھی دل سے فرشتوں کے سفید ہوتے لباس بھورے رنگ کے پھیکے لباس سروں پر بکل مارے دوپٹے نہ گئے یہ دکھ شاید میرے دل میں چپک گیا تھا کہ نہ کبھی انہوں نے لپ اسٹک کا ذائقہ چکھا نہ پرفیوم بلکہ عطر کی موت آمیز مہک کیوڑا، کافور اور اگربتیوں میں گھلا ماند پڑتا حسن میرے دل کا دکھڑا بن گیا.....

بہت سے مرد کولیگ اور افسران کی مہربانیاں حاصل تھیں میری گاڑی لائف سٹائل اور لگژری فلیٹ پر نظر تھی، جس کے سبب اڑتیس 38 برس کی عمر میں اتنے رشتے تھے کہ اماں ابا قبر میں پڑے دیکھ سکتے تو حیران ہو جاتے اور کم عمری کے درمیانے اوسط درجے کے چند رشتوں کو بھول جاتے.....

میں ہنستی کھیلتی ڈنرز لنچز میں موجود تھی شہر کی کوئی تقریب میرے بنا نہ ہوتی مکمل عورت ہونے کی وجہ سے لمس کی حرارت اور اہمیت سے نابلد نہیں تھی..... مگر خالی خولی مرد میری آرزو کیسے ہو سکتا تھا اس مرد نے وہ معاشرے بنایا تھا، جہاں اُس کی مائیں بہنیں کم عمر بچیاں تلاش کر کے دیر تک صحت مند ماں بہو اور بیوی کے رول کی طلبگار تھیں عورت محض ایک کم عمر صحت مند جسم تھی اُن کے نزدیک..... اور یہی مرد گھروں میں وہی کم عمر لڑکیاں ڈال کر چار چار بچوں کی ماں بنا کر اُن کے بدن ڈھلکا چکے تھے ٹائم مانگتی جاسوسیاں کرتی بھدے جسموں والی کم عمر عورتیں اپنی کم عمری کے لیے حوالے دیتی نہ تھکتیں مگر آئینہ طنزیہ مسکراتا رہتا یہ دنیا بس ظاہری لش پش دیکھتی ہے اور اس کے لیے تین چار دیوروں کی بھابی ماں نندوں کی سازشوں کا جواب دینے والی بھابی ساس سسر کو ہسپتالوں تک سنبھال کر شوہر کی مسکراہٹ کمانے والی ڈھلکی ہوئی عورت چار چھ کمیٹیوں چند سونے کے گہنوں کی وقتی

مالکہ جو سسرال کے پہرے میں اٹانے کی پوٹلی تھامے بیٹھی ہو کیسا مضحکہ خیز تھا.....

میں خوش تھی اہمیت افسری مردوں کی ماتحتی اور اپنی سربراہی نے خود سر بنا دیا کام اتنا بھی رہتا تو اچھا تھا ورزش اور سٹائل کے بل پر لڑکی جیسی لگتی کم عمری کا شوق نہیں تھا اور نہ ہی واحد اس خوبی پر بیویاں بننے والی لڑکیوں سے موافقت میں انہیں بطور انسان زمانے میں جیتے دیکھنا چاہتی تھی.....

افسری کے درجات بڑھ رہے تھے اور عمر ڈھل رہی تھی قدرت اور معاشرہ مل کر عجب توازن قائم کر رہے تھے اب لوگ مجھ پر نظر رکھتے ہوئے میری تنخواہ کو بھی رشتے میں شامل کر رہے تھے جتنی عمر بڑھ رہی تھی اتنی ہی تنخواہ اور مراعات بھی۔ میں ابتدا ہی سے اس بات کی قائل تھی کہ رونے کے لیے بھی خوشنما کونا ہونا چاہیے یہ نہیں کہ آپ بیٹھے آنسو بہا رہے ہیں اور دروازے پر کھڑا مالک مکان کرایہ ادا نہ کرنے پر مکان خالی کرنے کا مطالبہ کر رہا ہو اس سے نا صرف آپ کا غم غلط بھی نہیں ہو سکتا بلکہ غم کی ساری محفوظیت بھی چلی جاتی ہے اور اس کا مخصوص احترام بھی..... لہٰذا غم منانے کے لیے بھی چھت کا ہونا ضروری ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ غموں اداسیوں اور دیگر لوازمات کو ملتوی کر کے پہلے گھونسلہ بنایا جائے..... یہ مشورہ میرے جیسے مڈل کلاس گھرانوں کی لڑکیوں کے لیے ہے امیروں کے اور مسائل ہوتے ہیں۔

خیر مراحل تمام ہوئے ابھی نوکری کے چند سال بھی پڑے تھے کہ دل میں عجب چنگاری بھڑکی.....

حاکم عورتوں کو بھی مرد متاثر کر سکتا حیرت ہے میں عجب پریشانی میں تھی اُس نے بھی اپنا شاندار کیریئر بنا رکھا تھا مجھ سے کم عمر تھا میری کالونی میں اُسے گھر خریدنا تھا جبھی میرے گھر کو مکمل دیکھنے کا خواہاں تھا بلایا تو اُسے نوکروں کی موجودگی میں تھا، مگر وہ اپنی پیشہ ورانہ مجبوریوں کے کارن اتوار کو آیا چوکیدار میڈ ڈرائیور سب ندارد مجھے اُسے لوٹانا اچھا نہ لگا مبادا سمجھے میں عورت ہونے کی وجہ سے گھبرا رہی ہوں اندر آنے کو کہا پہلے غلطی سے ڈرائنگ روم کے دروازے میں ہم ہلکا سا ٹکرائے اُس کا اونچا قد مضبوط بازو چوڑے شانے مجھے سنبھال کر صوفے پر بٹھا دیا اپنے لمس کا نذرانہ کر کے بے نیاز انداز میں بیٹھا چائے طلب کر رہا تھا اوہاں..... اچھا..... میں سجے بنے کچن میں چائے کے لوازمات ڈھونڈ رہی تھی کہ اُس کی موجودگی عقب میں بول اُٹھی کیا پکایا آج..... وہ برتنوں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا کچن بھی ٹھیک ہے چھوٹا کچن کدھر ہے عموماً ساتھ ہوتا مگر میں نے اوپر پچھلے ٹیرس میں بنایا پراٹھوں روٹیوں پائے ساگ نہاریوں کے لیے..... گڈ..... نارمل سے حالات میں گھریلو گفتگو اپنا پن اور مرد سے مکمل ہوتا ہوا گھر میرے افکار پر عجب تازیانہ تھا میں

چائے بنا کر پلٹی بھی نہ تھی کہ وہ اپنا مگ تھام کر سیڑھیوں کی طرف آیا وہاں لگے ایک فیوز بلب کو اتارنے لگا۔ بلب ہے کوئی گھر میں...... میں کب سے تنگ تھی یہ ہولڈر بار بار خراب ہو جاتا اسے انویٹری باکس دکھایا وہ انہماک سے ہولڈر فٹ کر کے بلب لگا چکا تھا اوپر جاتا زینہ اُس کے قدموں کے ساتھ روشن ہو رہا تھا...... یہ پچھلی دیوار پر تاریں لگوا لیں میں کل بندہ بھیجوں گا ایک اور مسئلہ حل ہو رہا تھا ساتھ والوں نے آپ کی گرین بیلٹ پر آدھا قبضہ کر رکھا ہے بس یہ بڑے فضول ہیں...... کرتا ہوں کچھ ان کا...... کل ہی اپنے بل میں سمٹ جائیں گے یہ تو درمیانی دیوار سے جھانکتے بھی ہیں اچھا آپ نے اعتراض نہیں کیا خیر گردن پر رکھتا ہوں ایک کان پکڑ لیں گے میں نہ جانے کیوں اس کے پیچھے پیچھے کمرہ کمرہ پھر رہی تھی...... وہ سچویشن جو بظاہر رومانٹک نہیں تھی کتنی رومانس بھری تھی۔ پچھلے صحن میں کپڑے سکھانے والی تار ڈھیلی پڑی تھی وہ باتیں کرتا کرتا اُسے کس کے باندھ رہا تھا...... اُس کے قدموں کی مضبوط دھمک سگریٹ کی ہلکی سی مہک لبوں پر سگریٹ دبا کر ہتھوڑی سے کیل لگا رہا تھا ایک دن کی شیو بڑھی ہوئی تھی مردانگی شاید یہی ہے کیا فرق تھا طاقت کا وہ جو میں سوا پانچ فٹ کی عورت عہدے بینک بیلنس ملازمین کی مدد حاصل کر رہی تھی وہ ایک پینٹ شرٹ میں ملبوس قدرت سے نوازا ہوا طاقت سے بھرپور مرد...... لگا عورت اگر گھر ہے تو مرد اُس کا دروازہ ہے اُس سے ٹکرائے بغیر کوئی گھر کی عورت تک نہیں پہنچ سکتا...... رشتے کے بغیر بھی مرد کا وجود اپنی پوری اہمیت کے ساتھ گھر کی بیرونی دیواروں پر چسپاں رہتا ہے اس کے قدموں کی دھمک کمروں میں بے خوفی اور تحفظ کو بھر دیتی ہے۔

میں نے اپنے دل کے چور سے لڑنا شروع کر دیا اگلے دن سے میڈم بنی دفتر میں بیٹھی تھی چھ چھ فٹ کے بندے اپنے مسائل لیے سامنے درخواست کناں تھے اہمیت جاگ اٹھی تھی فرشتوں کے دکھ ہمراہ تھے کچھ دن سے ڈرائیور بدتمیزی کر رہا تھا میڈم آپ اسے سرشہزاد کے حوالے کر دیں خود کے لیے ہیڈ آفس سے دوسرا لیں فون ملاؤ شہزاد سے......

وہ لائن پر ہیں ناز بولی اوکے...... یہ میرا ڈرائیور بہت خودسر ہو رہا۔ ناز نے مشورہ دیا آپ کے حوالے کروں آپ فون بند کریں میں درست کرتا ہوں اسے نہیں یہ مجھے نہیں چاہیے کل بھی جب مارکیٹ سے سامان تھامے گاڑی تک آئی یہ اے سی آن کر کے ٹانگیں پسارے سو رہا تھا...... مجھے دیکھ کے بھی ذرا سا نہیں جھجکا...... اوکے میں بلوا رہا ہوں اسے آپ کو نذیر بھیج رہا ہوں میرا ڈرائیور...... اور آپ؟ میں آج رات پہاڑوں پر جا رہا ہوں وہاں خود ڈرائیو کرنا اچھا لگتا ہے اوکے...... میم سرشہزاد نے

ڈرائیور بھیج دیا آپ کی گاڑی صاف کر رہا ہے آپ کے ڈرائیور کی ایکسپلانیشن ہو گئی ہے معافیاں مانگ رہا...... مجھے نہ ملاتا...... واپسی پر دروازہ کھولے نذیر کھڑا تھا نظریں جھکائے بہت ٹریننگ ہوئی ہو جیسے......

رات سونے کے لیے لیٹی تو سوچا ونڈو والے ہی تھے تو لگوائے سپلٹ آئے تو تبدیل کیے بعد میں انورٹر میں بدل لیے...... ایسے ہی کیا شہزاد نہیں ملتے مارکیٹ میں ایک تو کم از کم مجھے چاہیے...... رات کو اپنے ہی چوکیدار سے دروازہ لاک کر کے بار بار چیک تو نہیں کرنا پڑے گا۔ جادو ٹونے کے پس پردہ بھی نا آسودہ خواہشوں کا جال ہوتا ہے۔ فرشتوں کے پاس یہ سہارے بھی نہ تھے میں نے تو نہ فرشتہ بننا چاہا اور نہ دائیوں کے ہتھے چڑھنے والی عورت...... اب مجھے اپنے آسودہ حال میں کسی کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی بار بار وہ دروازے میں ٹکرانے والا منظر کلائی پر بندھی مردانہ گھڑی آنکھ کے کونے سے نظر پڑے ٹھوڑی کا لرزنا کندھے پر پڑتا میرا ہاتھ اور ڈولنے سے قبل تھام کر بٹھانے والا منظر......

زندگی میں کچھ دوبارہ نہیں ہوتا انگلیوں میں دبا سگریٹ کش لگا کر محظوظ ہوتا ستون سے ٹیک لگا کر لڑکھڑایا ہوا انداز کیا کیا نہ تھا اس ملاقات میں۔

چوتھے دن نذیر نے بتایا سر شہزاد کے سرونٹ کوارٹر سے اپنا سامان لینے گیا تو بیگم صاحبہ نے سامان کے ساتھ دو ہزار بھی دیے پردہ کرتی ہیں عبایہ پہنتی ہیں...... فرشتہ ہیں بالکل فرشتہ......

دفعتاً میرے دائیں بائیں شانوں پر فرشتے پھڑ پھڑانے لگے فضا میں اڑنے لگے اُن کی ساری مظلومیت ساری اداسی مجھ خود مختار عورت کے وجود میں اُتر آئی......

مگر کچھ معلوم نہیں اُس کا شادی شدہ ہے یا کنوارہ کوئی اُس کے دل میں ہے کیا پتہ نہیں میرا احترام کرتا ہے یا شاید پسند کچھ معلوم نہیں بس اتنا ہے جب پکاروں He is There......

مگر کون بات کرے گا دفعتاً "فرشتے" یاد آ گئے ظالم لوگوں نے اُن کے گھر کو فرشتوں کا گھر مشہور کر رکھا تھا بچپن میں لڑکپن تک شام کو اس اداس دروازے کے پاس سے گزرتے ہوئے ڈرتی تھی مبادا کوئی روح اندر سے نہ جھانک لے فرشتوں کی ہنسی کبھی نہ سنی تھی شاید وہ مسکراتی ہوں کبھی اداس سی مسکراہٹ اندر ہی اندر نجانے کیا پکاتی کھاتی تھیں نہ کھانوں کی مصالحے دار خوشبو نہ چٹکیوں سے مہکا آنگن ہمارے گھر تو یوں ہمسائیاں آ جاتی تھیں جیسے پہاڑوں پر ساون ہاتھوں میں چوڑیاں سالن بھری کٹوریاں گھر آتی دائیاں دبانے والی تھی والی مڈوائف کچے پکے بچے ٹونے ٹوٹکے تعویذ دھاگے جو اس وقت تو مجھے اچھے نہ لگتے مگر شاید وہ عورتیں اپنے اپنے شہزاد کو بچانے کے لیے کرتی ہوں گی......

☆☆☆☆☆

دیواریں

چپ ہو جاؤ --- خدا کے لیے چپ ہو جاؤ--- آج مجھے بولنے دو---

یہ سب تمھارا ہی کیا دھرا ہے کہ میں دنیا میں وہ واحد شخص ہوں جس کی نظر میں--- مَیں پاگل نہیں--- باقی ساری دنیا مجھے پاگل سمجھتی ہے۔

معلوم ہے آج کیا ہوا --- عمر بھر پاگلوں کا علاج کرتے کرتے پاگل دکھائی دینے والے ڈاکٹر نے ہنس ہنس کر مجھ سے پوچھا۔

''اچھا تو کامران صاحب آپ کو کب سے لگتا ہے کہ دیواریں آپ سے بات کرتی ہیں--- حالانکہ ساری دنیا تو یہ کہتی ہے کہ دیواروں کے صرف کان ہوتے ہیں---

مجھے اس پر بہت ہنسی آئی مگر میں بالکل بھی نہیں ہنسا--- مجھے معلوم ہے میرے ہنسنے کو بھی اس نے میرا پاگل پن ہی سمجھنا تھا---

اس پاگل کو کون سمجھاتا جواب بھی کہ رہا تھا کہ ''کب سے لگتا ہے''، یعنی مجھے لگتا ہے--- یعنی ایسا ہے نہیں--- اس بے چارے کو کیا معلوم کہ تم میرا کیا حال کرتی ہو--- کتنا بولتی ہو--- کتنا چیختی ہو---

میرا دل چاہا میں ڈاکٹر سے پوچھوں ''ڈاکٹر صاحب کبھی آپ کو کسی فائزہ سے پیار ہوا''

خدا کے واسطے چپ ہو جاؤ--- شور سے میرے دماغ میں دھمک ہوتی ہے --- مجھ سے قسم لے لو جو میں نے فائزہ کے متعلق ڈاکٹر سے ایک بھی بات کی ہو--- یہ تو بس میں نے دل میں سوچا--- اس سے تو میں نے بس یہی کہا کہ ڈاکٹر صاحب اللہ ہر کسی کو بولتی ہوئی دیواروں سے دور رکھے--- یہ جب بولتی ہیں تو بہت بولتی ہیں--- اتنا بولتی ہیں کہ دماغ کی ساری نسوں میں بس شور دوڑتا ہے--

وہ بس ہنستا رہا--- وہ والی ہنسی جو دکھائی نہیں دیتی--- سجھائی دیتی ہے۔

پھر اس نے مجھ سے کہا ''سنا ہے آپ فٹبال بہت اچھا کھیلتے تھے--- ''اس کے بعد معلوم نہیں اس نے کچھ کہا یا نہیں--- مَیں میرا ڈونا کی طرح بال لے کر دور نکل گیا--- ''

فٹبال کامران بلوچ کی ٹانگوں میں لٹو کی طرح گھوم رہا تھا--- ایران سے آئی ٹیم کے پانچ کھلاڑی بیک وقت اُس سے بال چھیننے کی کوشش کر رہے تھے--- ان بے چاروں کو کہاں معلوم تھا کہ آج فائزہ بھی میچ دیکھنے آئی ہوئی ہے---

اُس نے اچانک ان پانچوں کی جانب پشت کی اور دائیں پاؤں کے ترچھے وار سے بال کو زمیں سے اٹھایا-- بائیں پاؤں سے مزید ہوا میں اچھالا اور قوس بناتے ہوئے الٹی قلابازی کے دوران ہی ہوا میں بائیں پاؤں سے پوری قوت سے کِک لگائی---

خالد ندیم شانی

ہائے --- اب مڑ کر کیا دیکھنا ---
اب تو لوگوں کا شور اور فائزہ کے اٹھے ہوئے بازو بتا رہے تھے کہ گول ہو گیا ہے ---
برا ہو ڈاکٹر کا --- سیدھا کلیجے میں ہاتھ ڈال کر پوچھ رہا تھا "سنا ہے آپ فٹبال بہت اچھا کھیلتے تھے"
پھر اس نے کہا "اچھا چھوڑیں فٹبال کو ... یہ بتائیں سیاست سے کوئی دلچسپی ہے آپ کو"
"ٹھاہ ٹھاہ کی آواز سے دو گولیاں چلیں اور ایک خاتون سیاست دان کے سر میں جا لگیں"
"ڈاکٹر صاحب ہم تماش بین قوم تھے ... ہیں اور رہیں گے مگر ہم سے سیاست کا ننگا ناچ نہیں دیکھا جاتا"
معلوم نہیں وہ میری بات کو سمجھا یا نہیں بس مسکراتا رہا
اچھا اب اگلی بات سن کر واویلا مت کرنا ---
تم چاروں جب بیک وقت حملہ کرتی ہو تو میں بات بھول جاتا ہوں --- میں نے ایک لفظ نہیں کہا فائزہ بارے --- ڈاکٹر نے خود پوچھا --- خود بتایا --- پھر پتا نہیں میں نے کیا کیا کہا --- مجھے ٹھیک سے یاد نہیں ---
اچھا اچھا بتاتا ہوں --- ایک دم ہی بھڑک اٹھتی ہو ---
"آپ نے فائزہ کامران سے شادی اپنی مرضی سے کی تھی؟"
"نہیں --- امی کی مرضی سے
"چودہ سال ہو گئے شادی کو --- میرے تین بچے ہیں ایک بیٹی ہے اور دو بیٹے

میں اچھی بھلی زندگی گزار رہا تھا مگر اچانک سب کو لگنے لگا میں بیزار ہوں --- ہر شے سے بیزار --- میں پوچھ پوچھ تھک گیا ہوں کہ آخر ان کو کس نے کہا کہ میں بیزار ہوں
الزام یہ ہے کہ میں کسی سے بات نہیں کرتا --- دکھ یہ ہے کہ میری ہر بات کا دوسرا مطلب نکال لیا جاتا ہے
میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب میرے گھر والوں کو سمجھائیں کہ مجھے پاگل سمجھنا چھوڑ دیں --- میں ایک نارمل انسان ہوں --- فرق صرف اتنا ہے کہ دیواریں ان کے ساتھ نہیں بولتیں --- میرے ساتھ بولتی ہیں ---
پھر معلوم نہیں کیوں مجھے رونا آ گیا --- ڈاکٹر پریشان ہو کر مجھے چپ کرانے لگا اور کہا کہ اچھا ابھی آپ خود کو سنبھالیے --- باقی باتیں کل کریں گے ---
میں نے بھی سوچا --- باقی کا رونا یہیں تمہارے پاس آ کے روؤں گا ---
بتاؤ کیا کروں اب --- اسی طرح پھر سے چیخوں --- پھر سے چلاؤں ---
تم نے برباد کر دی ہے میری زندگی --- تم ہی روزانہ میرا گریبان پکڑ لیتی تھیں --- ماں کی بات مان جاؤ --- بوڑھی ماں کو دکھ مت دو --- کتنا ارمان ہے اسے تمہارے ماتھے پہ سہرا دیکھنے کا ---
ہزاروں نہیں --- لاکھوں بار ہاتھ جوڑے تھے کہ جب فائزہ نہیں تو کوئی نہیں --- فٹبال کافی ہے ...
یاد ہیں وہ اپنی بے کار کی دلیلیں ---

''آنکھیں بند کر لینے سے ساری عورتیں ایک جیسی ہو جاتی ہیں--''
کوئی بات نہیں اِس لڑکی کا نام بھی فائزہ ہے --- تم اِس میں اپنی فائزہ ڈھونڈ لینا--''
جھوٹی تھیں تم چاروں --- آنکھیں بند کر لینے سے عورتیں ایک جیسی نہیں ہو جاتیں---''
''احساس کا برف زار... نام کی مماثلت سے نہیں پگھلتا--''
''مجھے اپنی محبت کے کھو جانے سے بھی بڑا دکھ یہ ہے کہ تم چاروں نے مجھے کتنا سطحی سمجھا---''
مجھے بس رونا ہے... تیز رفتار ٹرالر کی زد میں آ کر کچلی جانے والی فائزاؤں پر... دہشت گردی میں مارے جانے والے لوگوں پر...
اور تم جیسی بولتی ہوئی دیواروں پر جو بولتی تو ہیں ... لیکن زخموں پہ مرہم نہیں کچوکے لگاتی ہیں۔
شادی کے تیسرے دن سے آج تک فائزہ ایک ہی جملے کا تکرار کیے جاتی ہے
''میں وہ ٹرالر نہیں ہوں جس نے آپ کی فائزہ کو کچلا تھا''
وہ خدا کی بندی کریدنے کو مرہم سمجھتی ہے
توجہ دو، محبت سے پیش آؤ تب بھی فائزہ کا طعنہ۔
کسی بھی سبب سے چپ بیٹھنا فائزہ کو یاد کرنا ہی سمجھتی ہے
راستہ کہاں ہے... کدھر بھاگ جاؤں
نہ ہنس سکتا ہوں نہ رو سکتا ہوں... نہ جی سکتا ہوں نہ مر سکتا ہوں...
مر کیوں نہیں سکتا... معلوم ہے کیوں نہیں مر سکتا
اسی پگلی کی وجہ سے ...میں اس کا لباس ہوں-- اُسے بھری جوانی میں بے لباس کیسے کروں...
''اور میں اپنے بچوں کی وجہ سے نہیں مر سکتا ... ان کی مسکان میں مجھے کامران بلوچ ہنستا دکھائی دیتا ہے...
شاید یہ بھی ایک بہانہ ہو جینے کا-- مگر جینا میں خود چاہتا ہوں.....
اگر جینے دیا جائے
میں چاہتا ہوں فائزہ کی کسک صرف مجھ تک محدود ہو... وہ فقط مجھے یاد رہے... میری بیوی کے لیے وہ مر جائے
میں چاہتا ہوں میری بیوی اپنے سکون کی جنت میں میری پچھلی محبت کا سانپ نہ گھسنے دے-- اور میں اپنی محبت کی خوشبو کو اپنے اندر سے باہر نہ آنے دوں--
کبھی کبھی میں اِس فائزہ کو لے کر ان رستوں پہ نکل جاؤں جہاں میں اُس فائزہ کے ساتھ جاتا تھا،
دونوں کھٹارا سس کا جھولا جھول کر واپس آئیں
جب بھی وقت ملے میں فلبال دیکھوں ... اپنے بیٹے کو فلبالر بنانے کی دھن میں لگ جاؤں...
بات کتنی سادہ سی ہے مگر کتنی الجھی ہوئی ہے...
وقت کی مٹھی سے ریت پھسلتی جا رہی ہے اور کوئی ایسا نہیں جو اپنے ساتھ کے چھڑکاؤ سے ریت کو گیلا کر دے...!

☆☆☆☆☆

لاری اڈا، کھٹارا طیارہ اور لوکل روڈ

کچھ سفر حسین ہوتے ہیں تو کچھ منزلیں شاندار۔ مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ بندہ سفر اور منزل کی فکر بھول کر مسافروں میں کھو کر رہ جائے۔ کبھی انسان سفر کو بھول جاتا ہے تو کبھی منزل گم کر بیٹھتا ہے مگر یہ ایک کمیاب واقعہ ہے کہ بندہ سفر اور منزل سے بے نیاز ہو کر مسافروں میں توجہ مرکوز کر بیٹھے۔ زندگی میں کچھ ایسے سفر اور مسافر بھی گزرتے ہیں کہ ان کے متعلق سوچ کر بندہ ہنسی روک نہیں پاتا اور ہنس کر کہتا ہے ''دھت تیری'' کتنی مضحکہ خیز یاد ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ ابھی پیدا نہیں ہوا۔ میں کہتا ہوں کہ جس نے لاہور کا لاری اڈا نہیں دیکھا وہ ابھی عالم ارواح میں ہے، پیدا ہونے کا مرحلہ تو بہت بعد کا ہے۔ لاہوری لاری اڈا ایک ایسا لاری اڈا ہے جہاں ایک طرف منزلوں کے سفر شروع ہوتے ہیں، ارمانوں کی دنیا پروان چڑھتی ہے، خوابوں کی تعبیر ہوتی ہے تو دوسری طرف انسان سفر کی تکالیف کا لباس تار تار کرتے ہوئے گھر کا رخ کرتا ہے۔

لاری اڈا ایک ایسی جگہ کا نام ہے جہاں موجود ہر شخص مسافر ہے۔ لاری اڈے میں بکھرے مسافروں کو دیکھ کر اچانک میر کا مصرعہ یاد آجاتا ہے۔

''ساز پیسج روانہ ہے سب قافلے کی تیاری ہے''

ہر لاری اڈے پر تین طبقات کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ لاہوری لاری اڈا بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ یہاں طبقات سے مراد سماجی طبقات نہیں بلکہ معاشرتی گروہ مراد ہیں۔ ایسے گروہ جن کو کمیونٹی کہا جا سکتا ہے۔

پہلا طبقہ ڈرائیور اور کنڈکٹر حضرات کا ہے۔ اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ طبقہ بڑا منہ پھٹ ہوتا ہے۔ بسوں کو طیارہ کا نام دے کر خود کو پائلٹ تصور کرنا اور جہاز ران کی قابلیت کے ضمن میں ''پکا سگریٹ'' استعمال کرنا، اس طبقہ کی پہچان ہے۔

دوسرا طبقہ لاری اڈا پر مختلف اشیاء بیچنے والوں کا ہے۔ اس طبقہ کے لوگوں کی پہچان یہ ہے کہ ان کی آنکھوں سے گداگری، چہرے سے مسکینیت، کپڑوں سے فقیری، اور ہاتھوں سے مزدوری ٹپکتی ہے۔ یہ طبقہ کبھی مجبوری کی داستان تو کبھی لاچاری و بے بسی کی تصویر پیش کرتا، زبردستی مختلف اشیاء بیچتا نظر آتا ہے۔

تیسرا طبقہ وہ طبقہ ہے جو پہلے طبقہ سے خفا تو دوسرے طبقہ سے بیزار ہوتا ہے اور بے بسی کی تصویر بنا بار بار گھڑی پر نگاہ ڈالتا ہے۔ عرف عام میں اسے ''مسافر'' کہا جاتا ہے۔

طیاروں میں بیٹھے مسافر جس سے بے حال اور ان کے بچے، جن کو ماؤں نے سرسوں کے تیل سے خوب تر کیا ہوتا ہے، گرمی کی تپش سے پکوڑا ہو رہے ہوتے ہیں مگر ڈرائیور اپنی ہستی میں مست سگریٹ سلگائے چالیس ہزار فٹ کی بلندی پر محو پرواز ہوتے ہیں۔ مسافروں کی آہ و

علی حسین اویس

زاری سے اگر ان کے اندر رحم کا جذبہ پیدا ہو جائے اور وہ گاڑی سٹارٹ کرنے لگیں تو کنڈکٹر چلانے لگتے ہیں کہ ابھی وقت نہیں ہوا۔ یہ جملہ سن کر مسافروں پر یہ راز عیاں ہوتا ہے کہ

''مقامات آہ وفغاں اور بھی ہیں''

کنڈکٹر کو اگر بس کا منکر نکیر کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ وہ مسافروں سے ایسے ایسے سوال کرتا ہے جن کے پوچھنے کا حق خدا کے بعد صرف پولیس افسر کو ہوتا ہے۔

اگر مسافر کنڈکٹر کے چنگل سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو زبردستی اشیاء فروخت کرنے والے دھاوا بول دیتے ہیں۔ وہ اشیاء نہیں بلکہ لاچاری کا ہنر بیچتے ہیں۔ ان سے مسافر کسی صورت بچ نہیں پاتا۔ یا تو پیسے جاتے ہیں یا کنجوسی کا ٹھپہ لگ کر عزت۔ یہ مسافر کو خود طے کرنا ہوتا ہے کہ وہ اپنی عزت بچائے یا پیسہ۔ یہ مرحلہ اتنا مشکل ہوتا ہے کہ محبت کی آگ کے دریا سے گزرنا بھی اتنا مشکل نہ ہوتا ہوگا۔

یہ تو تھی لاری اڈا کے تناظر میں طبقاتی بحث۔ لگے ہاتھوں ان بسوں کی شان بھی سنتے جایئے جن میں ڈرائیور پاکٹ، کنڈکٹر منکر نکیر، زبردستی اشیاء بیچنے والے جابر اور مسافر بے بس اور لاچار ہوتے ہیں۔

ان بسوں کی خاصیت یہ ہے کہ یہ جا کہیں ہو رہی ہوتی ہیں اور پہنچا کہیں اور ہی دیتی ہیں دوسرے لفظوں ان کا رُخ جانب مشرق ہوتا جبکہ منزل اختتام سفر پر ہی واضح ہوتی ہے۔ ان بسوں کی کھڑکیوں کے شیشے نہیں ہوتے۔ اور جن راہوں کی خاک چھانتے ان کی یہ حالت ہوتی ہے وہاں سڑک کے بجائے کھائیاں ہوتی ہیں۔ ان کھائیوں کی حکمت شاید یہ ہے کہ مسافر زندگی کے تلخ رخ سے واقف ہو کر دنیا کی محبت دل سے نکال پھینکیں اور آخرت کی فکر کریں۔ ایک دانش مند نے اس معاملہ کی یوں تعریف کی ہے، یہ کھائیاں اس لیے بنائی گئی ہیں کہ مسافروں کے گناہ جھاڑے جا سکیں۔

ایک واقعہ یاد آ گیا، آپ کو سنائے دیتا ہوں۔ ایک بار میں ''تو قیر طیارہ'' میں سفر کر رہا تھا۔ اس طیارے میں ہر وہ خاصیت موجود تھی جن کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے۔ ہوا کچھ یوں کہ اچانک بارش برسنے لگی۔ بارش کی تیز بوچھاڑ ٹوٹے شیشے سے اندر داخل ہوئی تو ایک بچہ ڈر کر چیخنے لگا۔ رستہ پر موجود گڑھے پر سے گزرتے وقت بس اچھلی تو بچہ سہم کر چپ ہو گیا اور اس کی ماں چیخنے لگی۔ یہ منظر دیکھ کر بس کے آخر میں بیٹھی بوڑھی عورت چلائی ''پڑھو لا الہ الا اللہ''۔ بس گونج اٹھی اور میں موت کی آہٹ پا کر بے اختیار دعائے جنازہ پڑھنے لگا۔

ان بسوں میں سفر کرنے کے دو اصول ہیں۔ پہلا یہ کہ بندہ بے عزتی کے احساس سے ناواقف ہو اور دوسرا یہ کہ دل کا عارضہ لاحق نہ ہو۔ یوں آپ محفوظ رہیں گے۔ وہ الگ بات ہے کہ ان بسوں میں ایک بار سفر کر چکنے کے بعد بلڈ پریشر کچھ اوپر نیچے رہنے لگتا ہے۔

اگر آپ ان بسوں میں سفر کرنے کے خواہشمند ہوں تو سب سے قبل غسل فرمائیں اور تمام رشتے داروں اور جاننے والوں سے معافی مانگ لیں اور حقوق معاف کروا لینے کے بعد لاری اڈا کا رخ کریں۔ عین ممکن ہے کہ آپ جائیں دیدہ زیب لباس میں اور آپ کو واپس، سفید پیراہن میں لایا جا رہا ہو۔

☆☆☆☆☆

پنجاب کے گمشدہ کردار ___ فیدو فٹے منہ

پھُر پھُر پھاک لگے رہن، شاہ جی داویڑا اوس دارے۔ شاہ جی فیدو دی حاضری لگے تے ''خیر ہووے، خیر ہووے خیر ہووے کہنے کے بعد فیدو کچھ دیر خاموش رہا پھر خود کلامی کے انداز میں آہستہ سے مخاطف ہوا'خیر ہووے، انی دیر، پھر پنجوں کے بل کھڑے ہوکر گلی میں کھلنے والی کھڑی سے اندر جھانکنے لگا، وہ کچھ پریشان ہوا ہی تھا کے اس کے کاندھے پر ایک نرم سی دستک ہوتی، فیدو نے گردن گھما کر دیکھا تو سامنے شاہ جی کھڑے تھے، فیدو نے فوراً شاہ جی کے پیروں کو ہاتھ لگایا پھر وہی ہاتھ پیشانی تک لے جا کر، ایک سلیوٹ مارا، اور مخاطب ہوا، شاہ جی اینی دیر، خیر ہووے، تہاڈے دلوں جواب نہ ملے تے لگدا اے، تسی واپس جنت چلے گئے ہو۔

شاہ جی نے اس کا پورا مکالمہ سنا اور بولے، فیدو یارتوں بہت سوہنی بکواس کردا ایں__ فیدو نے یہ سنا تو اپنے مخصوص انداز میں ہاتھ جوڑ کر اور کاندھے جھکا کر مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ مخاطب ہوا، بس شاہ جی تسی جو سیکھایا او بولدا تا _ ساڈی کی مجال اے، تہاڈے تو زیادہ بہتر بکواس کر سکیے_ پھر ہی ہی ہی کہہ کر خوشی کا اظہار کیا۔ فیدو اپنی ہی ہی ہی کو ہی ہنسی کا نام دیتا ہے فیدو کا سارا دن یونہی دروازوں پر دستک دیتے اور کسی دکان کے تھڑے پر دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر آرام کرنے میں گزر جاتا ہے، فیدو، کا اصلی نام فدا خان ہے، جو کثرت استعمال سے فیدو بن گیا ہے، نیلے رنگ کی ڈبی والی دھوتی، اُونچا سا کرتا او پھر اس پر مٹی رنگ کا سلوکا پہنے، ہاتھ میں چموٹا لیے یہ ہر گلی محلے میں نظر آجاتا ہے یوں تو یہ سارا سال ہی دروازوں پر دستک دیتا ہے اور خیر ہووے خیر ہووے کا نعرہ لگاتا ہے مگر شادی بیاہ اور بچے کی پیدائش پر اس کی آمد کا مطلب ہوتا ہے کہ اب خوشی مکمل ہوگی، کبھی کبھی فیدو لوگوں سے ملنے میں وقفہ بھی لاتا ہے، اور جب کوئی اس سے پوچھے کہ یار فیدو، بڑے دن لگا دیئے کدھر تھے، تو یہ بہت معصوم سی صورت بنا کر بڑے فخر سے کہتا ہے میں اپنی زمینوں پر گیا ہوا تھا، پھر خود ہی زمین پر پاؤں مار کر، سیلوٹ کرتے ہوئے کہتا ہے بادشاہو، فیدو نے کدھر جانا ہے، تسی، قدماں دے وچ ویکھو

اعجاز رضوی

فیدو نظر آجائے گا۔ فیدو کی جلد کا رنگ کالا ہے، اس پر یہ سرسوں کا تیل مل کر اس جلد کو اور بھی کالا چمکیلا بنا دیتا ہے، یوں اس کی آنکھیں اور بھی سفید لگنے لگتی ہیں۔ سگریٹ پینے سے فیدو کے ہونٹ اور دانت پیلے ہو گئے ہیں اس لیے جب یہ ہی ہی ہی کرتا ہے تو ایک ہاتھ منہ پر رکھ لیتا ہے، اگر کوئی اُسے منہ پر ہاتھ رکھنے سے منع کرے تو کہتا ہے، یار تسی اے نہ سمجھو، فیدو زردہ کھا کے آیا اے، زردے کا ذکر کرنے کے بعد فیدو مخاطب ہوتا ہے، سرکار اگر گڑ والے مٹھے چاول مل جان تے حیاتی تازہ ہو جائے فیدو کے اس طرح یکدم فرمائش کرنے پر اکثر خواتین اس کو فٹے منہ کہہ دیتی ہیں اس لیے فٹے منہ بھی اس کے نام کا حصہ بن گیا ہے، کبھی کبھی تو یہ اپنے مخاطب سے خود ہی کہہ دیتا ہے، کہ اے کی فیدو فیدو لائی اے، پورے ناں نال بولاؤ۔ فیدو فٹے منہ، فٹے منہ، وہ اس طرح ادا کرتا ہے کہ سننے والے کو ہنسی آجاتی ہے۔ فیدو کس گاؤں کا رہنے والا ہے، یا کس شہر سے آیا ہے یہ بات کسی کو معلوم نہیں، اور نہ ہی کسی کو یہ راز معلوم ہے کہ فیدو اکیلا کیوں ہے، ورنہ عام طور پر فیدو جیسے لوگ، اپنے ساتھی کے ساتھ پھرتے ہیں، ایک کے ہاتھ میں چموٹا ہوتا ہے، جسے آج کل لوگ پٹہ کہتے ہیں، اور وہ ایک دوسرے کو مخاطب کر کے باتیں کرتے ہیں، مگر یہاں فیدو کو ہمیشہ ہی اکیلے دیکھا گیا فیدو سے پوچھو تو ایک لمبی داستاں سناتا ہے اور کہتا ہے بادشاہو میں ازلاں دا کلا نئیں، میرا اک بیلی تھا، امداد خان، میں اس نوں میدو دے نام نال بلاوندا سی، بھلی چنگی گزر رہی تھی کے پنڈ دے چوہدری صاحب نے بلایا تے میدو نوں پھڑ کے حویلی اندر کر لیا تے مینوں ہار سنیا اے میدو حویلی وچ اے، پر صاحب جی، میں تے کلم کلا واں،

صاحب جی کسی نے دسیا اے کے میدو کو ڈیرہ بنانے کے جرم میں چوہدری جی نے قید کر لیا ہے، صاحب جی اے وی دکھری کہانی اے میں تے میدو پنڈ دے بار زمین پدری کر کے پانی پا کے بیٹھے تھے تو کسی نے پوچھا یہ کی، میدو کہا ڈیرہ، میدو فیدو دا ڈیرہ بس جی چوہدری جی کو پتہ لگا تو او خاطراں او خاطراں کے بس ہو گئی فیر میں لاہور تے میدو حویلی ___ صاحب جی کوئی نئیں، یہ حال وی ٹھیک اے، ویسے میں کب میدو کو یاد کرتا ہوں، یہ کہتے کہتے اس کے آنسو نکل آئے، اور وہ اپنے بازو کو آنکھوں پر رکھ کر کچھ دیر روتا رہا پھر ایک لمبا سا سانس لے کر بولا، تسی کس پاسے لا دتا، کوئی کسی واسطے ضروری نئیں، اپنا چموٹا تے اپنی گل، باقی چل سو چل، صاحب جی، رب سوہنے دی زمین تے زمین دار تے سور ہمیشہ خوش رہن، ساڈا کی اے، پھر پھاک لگے رہن تے خیر ہووے مولا خوش رکھے کہنا ہی ساڈی جھپڑی اے، اگر کوئی شخص موڈ میں آئے اور فیدو فٹے منہ سے پوچھے کے کوئی یادگار واقعہ سناؤ، تو وہ بڑی دانشورانہ انداز میں سوچتے ہوئے کہتا ہے کوئی ایک ہو تو بتاؤ کوئی ایک بھی نہیں، پھر ہی ہی ہی کرتا ہے، اور کہتا ہے، صاحب جی میں ایک دن جج صاحب کے بیٹے کی شادی میں گیا،

وہاں جج، افسر، تاجر، اخبار والے ٹی وی والے سب باتیں کر رہے تھے، میں نے کچھ دیر تو چھوٹا مارا آواز بھی لگائی مگر میری کسی نے نہیں سنی، اور لوگ باتیں کرتے رہے، تب مجھے کچھ غصہ آ گیا، میں نے اپنے ہاتھ پر چار بار چھوٹا امارا اور پھر اونچی ساری بانگ دی، تو سب خاموش ہو گئے، تب میں نے فرمایا مولا خوش رکھے، خیر ہووے، اک منٹ واسطے چپ تے ہو جاؤ، پتہ تے لگے کہ مراثی کہندا اے۔ میری گل سن کے سب چپ ہو گئے۔

بس پھر کیا تھا انھوں نے مجھے دو سو روپے دیئے تے نال دو دھکے تے میں بار، فیدو کو اپنے واقعات سنانے کا بہت شوق ہے مگر کسی ایک واقعہ میں بھی وہ خود کو شرم سار محسوس نہیں کرتا، اس کا کہنا ہے کہ کچھ نہیں ہوندا، بس محسوس نہ کرو، تے اسں ہی اسن ہے فیدو بچوں سے بہت پیار کرتا ہے، اس لیے خواتین بھی اس کی گرویدہ ہیں، یہ ہر خاتون سے مذاق کرتا ہے، اور گالیاں کھاتا ہے مگر ہنستا رہتا ہے فیدو گلی محلے میں اسقدر مقبول ہے کہ اکثر خواتین اس سے سودا بھی منگوا لیتی ہیں، اور بچے کچھ پیسے اُسے دے دیتی ہیں فیدو اُن پیسوں سے سگریٹ خرید لیتا ہے فیدو سگریٹ پیتا ہے مگر آج تک کسی نے اس کو سگریٹ پیتے نہیں دیکھا، اس کا کہنا ہے کے سگریٹ واسونا تے روٹی دی برکی لوکاں تو بچا کے رکھو

اس وقت فیدو کی عمر پچاس ساٹھ کے درمیان ہے یہ اکثر بیمار رہتا ہے، کوئی اس کی تنہائی کو دیکھتے ہوئے کہے کہ فیدو تو شادی کر لے تو یہ بڑی سے ہا بھر کر کہتا ہے، شادی تو کر لوں، پر اے ہن کلے بندے دا کم نئیں بیماری اور تنہائی نے فیدو کی رفتار کم کر دی ہے، پہلے یہ گلیوں گلیوں پھرتا تھا، بھاگ بھاگ کر کام کرتا تھا، مگر اب یہ آہستہ آہستہ چلتا ہے، اور اکثر خاموش رہتا ہے، کوئی پوچھے تو کہتا ہے اب میرا کیا کام رہ گیا ہے، جو چیتل لگا دو مراثی ہی مراثی نظر آتے ہیں۔

مگر فیدو فٹے منہ تو نظر نہیں آتا، اور جہاں فیدو فٹے منہ نہیں ہے، وہاں روتی صورتیں تو نظر آتی ہی آتی ہیں۔ کیونکہ قہقہہ مارتی زندگی، تو صرف فیدو فٹے منہ کے دم سے ہی قائم ہے اور اگر کہیں فیدو نہیں ہے تو فٹے منہ ایسی زندگی کا۔

فیدو بات ختم کرنے کے بعد کچھ دیر ادھر اودھر دیکھتا رہا، پھر مخاطب ہوا

شاہ جی، دھی چنڑ نہیں، میدو نہیں اپنا علاقہ نہیں۔ پھر بازو آنکھوں پر رکھ کر کچھ دیر روتا رہا پھر ہی ہی کرتے ہوئے مخاطب ہوا۔

شاہ جی زندگی کا فٹے منہ تو تب ہوگا جب زندگی ہو گی جب زندگی ہی نہیں تو پھر ور فٹے منہ فدا خان تیرا نالے تیرے ورگے سارے فیدو ورگے لوکاں دا۔

فیدو نے بات ختم کی اور چھوٹا ہاتھ پر مارتے ہوئے بلند آواز میں بولا۔

خیر ہو آپ کی، مولا خوش رکھے، شاہ جی میتوں یاد رکھنا، کے میں فدا خان سے فیدو بن گیا ہوں، شاہ جی اب مجھے فٹے منہ کہنا" کہ یہ تو میں نے کہنا ہے فیدو فیدو فٹے منہ، فٹے منہ

☆☆☆☆☆

ڈر لگتا ہے

صبح سویرے
چڑیوں کی چِر چِر کی بجائے
دور کسی بَن کے تِندیائے
صحن میں آئے
کوّوں کی کائیں کائیں سے
ڈر لگتا ہے
اندر کی سائیں سائیں سے
ڈر لگتا ہے

گھر سے نکل کر باہر جائیں
ہلکائی خونخوار ٹریفک دائیں بائیں
جانے کس پل
کن گھاتوں ہوٹھائیں ٹھائیں
یا کوئی اندھا موڑ نگل لے
اور نہ پھر واپس آ پائیں
لمحہ لمحہ
وہم سا دل بھیتر پکتا ہے
ڈر لگتا ہے

جن ہاتھوں میں ڈورا حوالی
لیے پھریں کشکول سوالی
ذہن کسی تدبیر سے خالی
کرے نمو کیسے ہریالی
تخت نہیں ہے
قسمت میں جیسے تختہ ہے
ڈر لگتا ہے

اک احساس قیامت ڈھائی
لوں لوں اندر آگ لگائی
درد نے اصل کی دید کرائی
کیا کیا گہرائی اتھلائی
شہرِ خبر کے
سب دربانوں پر سکتہ ہے
ڈر لگتا ہے

سوچ ہزار سوال اٹھائے
ٹھوس جواب نہ کوئی پائے

جلیل عالی

سچ سے کیا کیا سچ ٹکرائے
اتنی بات سمجھ میں آئے
اس دنیا میں
آگاہی بھی اک دختہ ہے
ڈر لگتا ہے

سر کی گٹھڑی کھل گئی یارا
سکھ سامان بکھر گیا سارا
تن بے جاں، من پارہ پارہ
پھر بھی کر لیں گے کچھ چارہ
لیکن چاند ستارے کی
کم ہوتی ہوئی جو چمک ہے
ڈر لگتا ہے

ڈر لگتا ہے
کیا کیا عیب مرے نشر ادے
کھوجی چاپ سے
ڈر لگتا
کب اپنا آہنگ گنوا دے
دل کی تھاپ سے
ڈر لگتا ہے
کس لمحے خود سے لڑوا دے
اپنے آپ سے
ڈر لگتا ہے

یارِ عزیز نثار ترابی کے لیے

یار نثار ترابی، کب تک،
سوچو بھی نا، آخر کب تک
خدمتِ شعر و سخن کی خاطر
اور تہذیبِ فن کی خاطر
یوں ہی اپنا آپ لُٹاتے جاؤ گے؟
زخم ہی کھاتے جاؤ گے؟

اک دن فرصت کے کچھ لمحے اپنے لئے بھی وقف کرو
اور ٹھنڈے دِل سے غور کرو
اب تک تُم نے شعر و سخن کے چراغ جلانے کی خاطر
اِس کوشش میں دنیا بھر کو شاداں رکھنے کی خاطر
اپنے آپ سے،
اپنی ذات سے کتنی ناانصافی کی ہے!
پیش کیا ہے اپنا کاندھا تم نے کتنے بونوں کو؟
سیڑھی بن کر کتنے لوگوں میں شہرت بانٹی ہے تُم نے
اپنے حِصّے کی عظمت بانٹی ہے تُم نے

اِک دن تنہا بیٹھ کے سوچو
اُن لوگوں نے بدلے میں کیا تُم کو دیا ہے؟
سچ کہنا کچھ پایا ہے؟
یا اپنا سب کچھ کھویا ہے؟

تم جس عہد میں اشرفیاں خیرات میں دیتے پھرتے ہو
اُس میں تو بس کھوٹے سِکّے چلتے ہیں

یہ سونے کی اشرفیاں اب بے وقعت ہیں،
بے قیمت ہیں
اب تو یہاں بس کھوٹے سِکّے چلتے ہیں!

یار نثار ترابی، کب تک،
سوچو بھی نا، آخر کب تک
یوں ہی اپنا آپ لُٹاتے جاؤ گے؟
زخم ہی کھاتے جاؤ گے؟

یار نثار ترابی، تم بھی اب تو
اپنے عہدِ منافق کا اک حِصّہ بن جاؤ تو اچھا،
اشرفیوں جیسی بے وقعت شے اپنی جیب میں مت رکھو
اِن کو دریا بُرد کرو
اور کھوٹا سِکّہ بن جاؤ
اپنے لئے دریا ہی رہو
اوروں کے لئے صحرا بن جاؤ

یار نثار ترابی، کب تک
یوں ہی اپنا آپ لُٹاتے جاؤ گے؟
زخم ہی کھاتے جاؤ گے؟

نسیمِ سحر

ڈھکوسلے

پانی بھر کر لائی ناری سر پر بوجھ اُٹھا
مٹکے پر بیٹھا کوّا اور مٹکا دیا گِرا

سیج پہ بیٹھی عورت دیکھے مورکھ کا چہرا
آنکھوں میں لہراتے بادل ! دِل کی پیاس بجھا

ایک ستارہ اُفق کنارے دیکھے ہے رستا
کھڑکی کھول کے بیٹھی جوگن پردہ ذرا ہٹا

لڑکی ڈھونڈ رہی تھی کچھ دِن سے جنگل میں جا
ساون کی پہلی بارش نے رستہ دیا دِکھا

گوری نے ساجن کی خاطر دامن لیا جلا
ہنڈیا چولہے پر رکھی اور پنکھا دیا چلا

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بیٹھے ہیں دِل میں خنجرِ حالات گھونپ کر
مظلوم تھے مگر بڑے سفاک ہو گئے

میری ماں [عالمی یوم ماں کے حوالے سے]

جب میں بالکل چھوٹی سی تھی
سبز فراک پہنتی تھی میں
ماں کہتی تھی
بیٹی، تیری ساری زیست ہری ہی گذرے
بھرا بھرا سا سبزے والا
ایسا جیون جس پر کالی رات نہ اترے
ماں کو سبزے سے الفت تھی
سبز ربن سے میری چٹیا گوندھا کرتی
میری آنکھیں دیکھا کرتی، کہتی رہتی
ان آنکھوں کو چیل نہ کوئی دیکھنے پائے
کوئی وحشت کھوج نہ پائے
میرا پیکر
ماں کو اچھا، بہت ہی اچھا، سب سے اچھا لگتا تھا
مجھے سنوارا کرتی تھی وہ
مٹھی مٹھی اپنے ہاتھوں مجھے نمایاں کرتی تھی وہ
ماں کی چاہت
ٹھنڈی ٹھنڈی مٹی جیسی
نہ کوئی شعلہ، نہ کوئی اگنی
بے حد کم گو ماں تھی میری
لیکن اس کا آنکھا اشارا
پلک ستارا
رب کا سایا
ماں تھی، کیا تھی
سمجھ نہ آیا
سرد رتوں میں ماں نے جتنی نرم دعائیں
میرے ماتھے کو بخشی تھیں
ان کا سورج جاگ اٹھا تھا
مجھ میں پتے پھوٹ پڑے تھے
شبنم ان پر رقص کناں تھی
اور شعور ذہانت بن کر
ہر تحریر میں آ بیٹھا تھا
ماں کہتی تھی
میری بیٹی
زرد رتوں سے میل نہ کھائے
سرخ چناری کھلتی جائے
لیکن پت جھڑ عریاں سچ ہے
اور ازل کی عریانی کو
کون ابد تک ڈھک پایا ہے؟
وقت ستم کے چھل بل لمحے
کون سکونت کر پایا ہے

فرخندہ شمیم

ماں مناظر کیسے دیکھے
قبر میں جا کر چھپ جاتی ہے
میری ماں بھی گور میں سوئی
اندھیاری راتوں نے میرے پیرہن کو کھینچنا چاہا
ماں نے قبر میں سسکی بھر لی
ناقدروں نے ہنر کو میرے بیچنا چاہا
ماں نے گور میں کروٹ بدلی
کچھ لوگوں نے ذہن کی شمعیں پھونکا چاہیں
ماں نے قبر میں ہاتھ بڑھائے
ماں کے اعضا زندہ ہو گئے
اب تو ماں تھی اور بس میں تھی
ماں نے کالے ناگ بھی اپنی پھونک سے مارے
چیلیں بھی دامن سے جلا دیں
میرے رستے ستھرے کر کے
منزل بھی ریشم سی بنا دی

آج میرا پیکر اجلا ہے
اپنی ہستی، اپنی نظمیں
میں نے ماں کے ساتھ بچا لیں
حرف دعا جو ماں نے لکھا
آج مرے جینے کا رستہ

دروازۂ شب

وہ خوفِ آب تھا آتش پرست لوگوں میں
برستے اَبر، کھلے پانیوں سے ڈرتے تھے
اک اضطرابِ مسلسل تھا صبحِ حیرت میں
اڑائے پھرتی تھیں بے سمت آندھیاں دل کو
ردائے خواب کسی غم سے چاک چاک ہوئی
شبِ خموش میں بے بس پکار کس کی تھی
کھلی تھی دہر سے بس اک کتابِ وحشتِ جاں
ہوا نہ بند کسی طور بابِ وحشتِ جاں
بھرا تھا درد کی مے سے سفالِ دل کس نے
حروفِ سادہ میں لکھا ملالِ دل کس نے

.....

لکھی تھی درد کی تحریر اُس کے چہرے پر
اک عکسِ کربِ گزشتہ تھا اُس کی آنکھوں میں
غمِ جہان خدوخال سے جھلکتا تھا
عصا جدائی کا تھا مے لرزتے ہاتھوں میں
پہن کے جسم پہ پوشاک نارسائی کی
یہ کون اگلے زمانوں سے لوٹ آیا تھا
کہاں تھے اب وہ محبت شناس اہلِ نظر
جو اہلِ ہجر کی دلداریوں میں رہتے تھے
جو درد والوں کے ہر راز کو سمجھتے تھے
جو غم کے ماروں کی آواز کو سمجھتے تھے

.....

یہیں کہیں پہ وہ گوہر شناس پھرتے تھے
جو جان لیتے تھے ہر آدمی کے جوہر کو
جنھیں خبر تھی کھرا کیا ہے کون کھوٹا ہے
جنھیں خبر تھی کہاں کون سا خزینہ ہے
جو گفتگو کے عوض دل کا حال جانتے تھے
جنھیں خبر تھی شب و روز کے تغیر کی
جو آتی جاتی رُتوں کا حساب رکھتے تھے
علومِ نجم و شبِ ماہتاب رکھتے تھے
جو آشنائی سے سوزِ دروں سے واقف تھے
عذابِ لذتِ جذبِ جنوں سے واقف تھے

.....

یہ کون عشق میں کل آشنائے وحشت تھا
غبارِ نیند کا جم سا گیا تھا آنکھوں میں
کسی بھی خواب کی تجسیم ہو نہیں پائی

شفیق احمد خان

پھرے ہیں سر پہ سوالوں کی گٹھڑیاں لے کر
ملے ہیں خاک میں سارے نجوم لفظوں کے
کسی بھی لفظ کی تفہیم ہو نہیں پائی
یہ زہرِ عصر رگوں میں اُتر گیا ایسے
ملی نجات نہ دل کو عظیم دانش میں
فلاحِ خلق نہیں ہے قدیم دانش میں

.....

سکھا نہ مجھ کو کسی حرفِ صبر کے معنی
تو میرے درد کی شدت سمجھ نہیں سکتا
پڑا ہوں دہر سے واماندہ جسم و جاں لے کر
بجھے چراغِ تسلی شبِ اذیت میں
کسی نظر سے کہاں اندمال ممکن ہے
بھریں گے زخم کہاں مرہمِ رفاقت سے
میں اک ملال مسلسل میں سانس لیتا ہوں
شرارِ خوف سے سب ساعتیں سلگتی ہیں
تو صبح و شام کی حدت سمجھ نہیں سکتا
تو میرے کرب کی شدت سمجھ نہیں سکتا

[طویل نظم سے اقتباس]

داستانِ شمع!

جل رہی تھی کہیں پہ روپہلی
شمع کوئی وفا کی راہوں میں
جس پتنگے کی اس کو حسرت تھی
جل کے پہنچا تھا اُس کی بانہوں میں

.....

شمع بولی تھی اُس پتنگے سے
میں نے تم سے کہا تھا مت آؤ
عشق میرا تو آگ ہے روشن
کس نے تم سے کہا تھا مر جاؤ

.....

اس کے قدموں میں آخری سانسیں
لیتے لیتے پتنگ تھا بولا
تم پہ خود کو نثار کرنا تھا
دل نے پہنا تھا عشق کا چولا

.....

پھر پتنگے نے چوم کر پاؤں
دم بھی اپنا وہیں نکالا تھا
شمع جلنے لگی تھی بے قابو
کیوں اسے عشق نے جلایا تھا

.....

عشق کا روگ کیوں لگا بیٹھا
آج خود کو بھی وہ مٹا بیٹھا

قطرہ قطرہ پگھل گئی شمع!
جلتے جلتے ہی جل گئی شمع!

اویس الحسن

امن

ہر قوم باوقار ہے امن و امان سے
حاصل انھیں قرار ہے امن وامان سے

امن وامان ہی سے زمانے میں پیار ہے
گلزار پُر بہار ہے امن و امان سے

رسیا ہر ایک شخص ہے راحت کا، چین کا
دنیا کا بیڑا پار ہے امن و امان سے

جنگ وجدل کی بات کسے راس آئی ہے
جنگ وجدل کی ہار ہے امن وامان سے

انسان بے قرار ہے امن و اماں بغیر
آرام ہے، قرار ہے امن و امان سے

اپنے وطن میں ہم بھی کریں امن کا نفاذ
روشن ہر اِک دیار ہے امن وامان سے

انسانیت کے روپ میں جنگوں سے گرد تھی
انساں پہ اب نکھار ہے امن وامان سے

مہر و وفا، خلوص کی بنیاد امن ہے
ہر دل میں پیار پیار ہے امن وامان سے

دنیا میں عظمتوں کا نشاں امن ہے ندیمؔ
عز و شرف، وقار ہے امن و امان سے

ریاض ندیم نیازی

14 اگست 1947

آج کے دن ہمیں جینے کی ادائیں آئیں
قائد قوم کی پھر یاد وفائیں آئیں

ایک بستی جسے ظلمات نے گھیرا پیہم
ظلم اور جور کا ہر سمت تھا پھیرا پیہم
کتنی قوموں کا تھا مذت سے بسیرا پیہم
سامراجی بھی لگا بیٹھے تھے ڈیرا پیہم

ایک انساں ہمیں خوابوں سے جگانے آیا
شبِ تیرہ کی سیاہی کو مٹانے آیا

تیرگی چھٹنے لگی مشعلِ حق کی ضو سے
ناؤ اس پار ہوئی وقت کی اندھی رُو سے
روشنی ہونے لگی صبح نئی کی لَو سے
بات ہر دل میں بٹھائی گئی طرز نو سے

ایسے انسان کی تعریف کہاں تک لکھوں
حسنِ کردار کی توصیف کہاں تک لکھوں

دل میں ہر شخص کے آزادی کا جذبہ جاگا
ہر طرف چاند ستارے کا پھریرا اُبھرا
واقعہ وہ کہ تحیّر سے سبھی نے دیکھا
کارواں منزلِ مقصد پہ سلامت پہنچا

مطلعِ شرق پہ خورشید قیادت چمکا!
شب گزیدوں کو ملا صبح نئی کا مژدہ

آج کے دن نظر آئی تھی سحر کی تنویر
آج کا دن ہے نئے خوابِ وطن کی تعبیر
آج کے دن نے دکھائی ہے نرالی تصویر
خطۂ پاک کی تصویر ہماری جاگیر

اس کو اک معجزۂ فہم و فراست کہیے
قائد قوم کا اعجاز قیادت کہیے

سید خالد یزدانی

نظم

یہ جھولا یہاں سے ہٹاؤ!
اُڑا لے نہ جائے، بہا لے نہ جائے
یہ دو رسیوں کا دو آبہ
ترے باغ و باغیچہ میں جھولنے والے سن لیں
دو آبوں کا اَب وہ زمانہ نہیں ہے
کہ جب چاہا بل دے کے
اور بل پہ بل دے کے
لہروں کی، پہروں کی پینگیں چڑھا دیں
زمانہ نہیں
دونوں ہاتھوں سے دو انتہائیں پکڑ کر
ہلاروں کی دھاروں پہ چلنا،
بتانا کہ یہ دائیں کا دائرہ
اَور وہ بائیں کا دائرہ
شغل قوسین کا
زور پکڑے ہوئے ساری شوقینیاں
اَور جوبن پہ جوبن، یہ غل اور یہ کل
سب اِسی قوس کے دو دہانوں پہ ہیں
اَب زمانہ نہیں،
اَب زمانہ ترے سبزۂ شرق پر
تازہ معزول پشتیں ٹکانے کا ہے
سب سروں سے ہنڈولا ہٹانے کا ہے
آؤٹنگ کی اداکاری،
پکنک کی نقلیں، بہت ہو چکیں
اصل کی سِل پہ اَب پیٹھ ٹِک جائے تو
بات آگے بڑھے، وقت آگے چلے
جیب میں سے نکالے ہر اِک سیر بیں
روزی روٹی سے پھولی ہوئی پوٹلی
پوٹلی کی گرہ کھولے،
اور کھانے لگ جائے روٹی پہ روٹی
گرہ پر گرہ کھولتا جائے،
کھاتا چلا جائے، اور لقمے لقمے پہ سر کو ہلائے
نہیں، واقعی اَب زمانہ نہیں
اِنتہاؤں سے لڑنے کو جانا نہیں!

شاہین عباس

محبت رائیگانی ہے

سُنا ہے اس محبت سے
کسی کو کچھ نہیں ملتا
مہکتا، پرسکوں جیون
غموں کے نام ہوتا ہے
کہا میں نے یہی سچ ہے
محبت میں نہیں دیکھا
کسی بھی دل کو چین آئے

بنا جس کے، نگاہوں میں
کوئی موسم نہیں سجتا
کوئی نغمہ نہیں جچتا
وہی گر روٹھ جائے تو
یہ جیون پھر نہیں ہنستا
بہت ان مول ہے یہ دل
اُجڑ کر پھر نہیں بستا

سُنا ہے اس محبت میں
کسی کو کچھ نہیں ملتا
بلا کی رائیگانی ہے
یہ اک الجھی کہانی ہے
یہی سچ ہے
یہی سچ ہے

محبت میں
کسی کو کچھ نہیں ملتا
مگر یہ سچ نہیں چلتا
دلوں میں زرد موسم کا
ٹھہرنا تو ازل سے طے شدہ ہے
محبت......رائیگانی ہے

ثمینہ سیدؔ

نذرِ خواجہ محمد زکریا

متاعِ حکمت و دانش سلام کرتی ہے
تیری نگاہ متانت کو عام کرتی ہے

خود اس کا رنگ نکھرتا ہے تیرے پیکر پر
سو خوش لباسی ترا احترام کرتی ہے

جہالتوں کو جلن ہے ترے تکلم سے
کہ تیری بات دلوں میں قیام کرتی ہے

تری جبیں پہ چمکتا ہے علم کا مہتاب
یہ چاندنی ترے آنگن میں شام کرتی ہے

گندھا ہوا ہے روایت میں تیرا ذہن رسا
یہ خامشی ترے لب پر کلام کرتی ہے

وہاں پہ لوگ گلابوں کو بھول جاتے ہیں
جہاں جہاں تیری خوشبو خرام کرتی ہے

سخن شناسی کی ایسی تجھے ملی دولت
جو اس دیار کا تجھ کو امام کرتی ہے

حروف و معنی کی پرتیں کچھ ایسے کھولتے ہو
کہ خوش نما یہ سخن کے خیام کرتی ہے

اس عمر میں بھی ترا یہ رخِ جمال افزا
یہ زرد رت بھی تجھے لالہ فام کرتی ہے

لکھا ہے جب زکریا تو یہ ہوا محسوس
کہ شاعری مری مجھ سے کلام کرتی ہے

نیاز مندوں کی صف میں کھڑا ہے سرورؔ بھی
اسے بھی تیری نظر ذی مقام کرتی ہے

سرور حسین نقشبندی

جاگتے خواب

پولی تھین میں نان، چپاتی
ٹین کے ڈبہ میں سالن
حفظانِ صحت کا لیبل
اور پانی کی بوتل
جھلمل کوٹھی، ٹھنڈے کمرے، تپتے بستر
ہائی پریشر ٹینشن---
گولی---
کچی نیند میں کچا آنگن
اُپلوں کے جاں سوز دھوئیں میں
آنکھیں ملتی بوڑھی مائیں
صبح سویرے چائی کی ٹھنڈی لسی
دیسی گھی میں گندھی ہوئی رات کی روٹی
ذہن کی تہہ سے اٹھنے والی
مرچ اچار کی خوشبو
خالص پیار کی خوشبو

جگراتوں سے بچ رہنے کی خواہش بھی
کیا کیا خواب جگا دیتی ہے
ماضی سے ملوا دیتی ہے

زعیم رشید

''گلہری کتنی ناداں ہے''

گلہری یہ سمجھتی ہے
محبت بانٹنے والے کسی کے اجنبی ہاتھوں
میں اُسکا رزق رکھا ہے
سمندر پار جنگل کے گھنے اک پیڑ کے نیچے
کسی بھی آنے والے کو
ذرا ستانے والے کو
وہ اپنا مان لیتی ہے
بساطِ وحشتِ دل کو
محبت جان لیتی ہے
وہ کچھ پل کی رفاقت میں فریبِ حُسنِ
اُلفت پر سبھی کچھ وار دیتی ہے
مگر یہ بھی تو ممکن ہے
محبت صرف جھانسا ہو!
تمھارے نرم ہاتھوں کا کسی شاطر شکاری نے
بنا کر جال پھینکا ہو
وفورِ شوق میں جس پر وہ تکیہ کر کے بیٹھی ہے
کُھلے مٹھی تو دھوکا ہو
گلہری کتنی ناداں ہے!

عاطف جاوید عاطف

میں کیا کرتا ہوں [نثری نظم]

اکثر یہ سوال
پوچھا جاتا ہے
کہ
آپ کیا کرتے ہیں؟
پوچھنے والے کا مقصد
میرا پیشہ جاننا ہوتا ہے
جبکہ
میں اس کو بتانا چاہتا ہوں
کہ
میں کیا کرتا ہوں
میں کبھی
کسی خوبصورت خیال کے ساتھ محوِ پرواز ہوتا ہوں
کبھی کوئی قافیہ ردیف
آ کر دستک دیتے ہیں
میں ان کے ساتھ کھیلنے لگتا ہوں
کبھی کوئی شخص مجھے اچھا لگتا ہے
میں اس کی کہانی بنانے لگتا ہوں
کچھ ادھوری کہانیاں ہمیشہ
تکمیل کو بھی ترستی رہتی ہیں
لیکن میں ان کو مکمل نہیں کر پاتا
کبھی کوئی واقعہ
ایسا اثر چھوڑتا ہے
میں کئی دن تک اس کو سوچتا رہتا ہوں
میں لفظوں سے کھیلتا ہوں
لفظ میرے اندر گونجتے رہتے ہیں
ہاں کبھی کبھی میں انقلابی بھی بن جاتا ہوں
اور
پوری دنیا کو بدلنا چاہتا ہوں
میں خواب دیکھتا ہوں
پھر خواب میں آئی تصویروں سایوں میں
اپنے الفاظ سے رنگ بھرتا ہوں
مجھے میرے خواب بڑے عزیز ہیں
میں ان کے ساتھ جینا چاہتا ہوں
مجھے معلوم ہے یہ کبھی مکمل نہیں ہو سکتے
لیکن خواب میرا سرمایہ ہیں
یہ مجھ میں جینے کی آرزو
اور محبت کی آگہی دیتے ہیں
میں چاہتا ہوں سب خواب دیکھیں
اور میں یہ بھی چاہتا ہوں
کوئی میرے سے پوچھے
میرے خواب کیا ہیں
ہاں میں خواب دیکھتا ہوں
اور
خواب سنانا چاہتا ہوں

☆☆☆☆☆

محمد کلیم

خواہش

دل میں تیری خواہش کا جب جنم ہوا تھا
دکھ کی پیداوار ہوئی
دل میں کوئی درد جگا تھا
اندیشوں نے سر اٹھایا
میرے دل کو بہکایا
لیکن میں نے
اپنے دل۔ کی راہ نہ چھوڑی
اپنے قوم قبیلے سے تو نسبت توڑی
مجھ کو تمھارے خواب سہانے لگتے تھے
پہروں جاگ کے سوچتی رہتی
خود میں تم کو کھوجتی رہتی
خود سے ڈھیروں باتیں کرنا
خود کو منانا خود سے لڑنا
جیون جیسے ٹھہر گیا تھا
منظر منظر رنگ جمے تھے
خوشبو میری بنی سہیلی
لیکن اس کے بعد کا منظر
دکھ درد اور تنہائی والا
رسوائی والا
اب یہ منظر جھیل رہی ہوں
جان پہ جیسے کھیل رہی ہوں
خواہش نے کیا رنگ دکھائے
میرے سارے خواب جلائے

رفعت وحید

kick Back

خوف آنے لگا ہے
گھر سے
جسے یقین کی ٹائلوں
خون کے گارے سے بنایا تھا
اب وہاں ریت ، کنکر اور پتھر ہیں
دروازے
(زنگ آلود)
بوسیدگی کے بوجھ سے مقفل ہیں
کمرے
اجنبیت اور تنہائی کی سرگوشیوں سے آباد ہیں
اور وہ۔۔۔آم کا پیڑ
جہاں پرندے
محبت کی زباں بولتے تھے
اب کہیں نظر نہیں آتے
خوابوں کی چڑیاں
نیند کے شبستاں سے کب کی اُڑ چکیں
مٹی کی سوندھی خوش بُو
کباڑیے کی دُکان سے ملتی ہے
سوئمنگ پول کے اندر
نگلیریا کے جرثومے تیرتے ہیں
باہر گلی میں
آوازوں کا شور
انسانیت کے نام پر
لانچوں پر سفر کرنے کی تبلیغ کر رہا ہے
گھر کی نیم عُریاں دراڑوں سے
بغاوت کی شعاؤں کا رنگ بنفشی ہے

امجد بابر

ایک اور گریہ

اقبال خان یوسف زئی

کچھ پریت کے وعدے جھوٹے تھے

کچھ ضبط کی باتیں جھوٹی تھیں

وہ جیت گئے میں ہار گیا

یہ بات ہی آخر سچ نکلی

جو بیت گیا سو بیت گیا

اب قسمیں وعدے کیا کرنے

تم اپنی راہ پہ چل نکلے

میں اپنی راہ بھی بھول گیا

اب منزلِ آخر پر آ کر

کیا سوچنے بیٹھا بھول گیا

جو بھول گیا، اب اُس کا درد بھی شاید میرے دِل میں نہیں

لیکن پھر بھی اس رات کے گہرے سناٹے میں

دِل کے اندر ہی اندر کوئی بولتا ہے

میری اپنی خاک میں مجھ کو رولتا ہے

میں بِکنے لگا ہوں

میں بِکنے لگا ہوں
کہ پندار کے خول میں
جسم سارا چٹخنے لگا تھا

میں بِکنے لگا ہوں
کہ سرسبز جنگل میں ہم
رات کو تتلیوں کو پکڑنے چلے تھے

میں بِکنے لگا ہوں
کہ آپ اپنے آدرش کو
ایک ریشم کے کپڑے میں
لپٹا کے اونچی جگہ چوم کے رکھ دیا ہے۔

باس پھولوں کی یہ
رنگ تتلی کے یہ
سب اصولِ کہن!
زلف کے پیچ و خم
منزلوں کے قدم
ہر گھڑی دم بدم
سب کتابوں کی قبروں میں
لفظوں سے کفنا کے دفنا دیے ہیں

میں بِکنے لگا ہوں
کہ جسموں کے سب چیتھڑوں کو
سنبھالو تمھی
میں تو تنگ آ چکا!

آؤ ناچیں سبھی
آؤ گائیں سبھی
قہقہے، قہقہے
آؤ بِکنے لگیں!
آؤ بِکنے لگیں!

یاسر فاروق

نثری نظم

بات کہنا مشکل ہو گیا ہے
لگتا ہے اس سے میری فریکوینسی نہیں ملتی
میں جو کہنا چاہتی ہوں اسے سمجھ نہیں آتا
لفظوں کا مفہوم بدل گیا ہے
یا پھر میں جذبوں کو لفظوں کا پیراہن اوڑھانا بھول چکی ہوں
گفتگو میں لامحدود تعطل ابہام کو جنم دیتا ہے
ہم دو مختلف سیاروں کے باسی لگتے ہیں
تمہیں میں غلط دکھتی ہوں اور مجھے تم
ہمارے درمیاں برسوں کی ذہنی دوری نے فاصلوں کی
خلیج اتنی بڑھا دی ہے جسے ہم چاہ کر بھی پاٹ نہیں سکتے
ہمارے تعلق میں خامشی سب سے حسین گفتگو ٹھہری
ہے جسے ہم اپنے اپنے مطلب کے مفہوم پہنا کر
اشانت رہنے کی ایکٹنگ کرتے رہتے ہیں
بے آواز سسکیاں کون سنتا ہے

نائلہ راٹھور

''دُھوپ''

اِس مختصر زندگی میں!
سوچا ہے!
تیرا سایہ!
تیرا ساتھ!
مانگنے سے بہتر ہے ____!
میں تنہائی کی چادر اوڑھے!
دُھوپ میں!
آ کر بیٹھوں!
جیون کے رازوں کو جانوں!
اپنی پرچھائیں کو دیکھوں!
اپنی ساری باتیں مانوں!
تیرا سایہ!
تیرا ساتھ!
مانگنے سے _____!
بہتر ہے _____!!

لیلیٰ رُباب

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

غبار ہو گئے اس کی نشاں دہی کے لیے
ہم اس کی رہ پہ رہے گردِ کارواں کی طرح

Mathew Arnald کی نظم

"A Nameless Epitaph" اور "Persistency Of Poetry" کا اردو ترجمہ

کتبے کے بغیر قبر

اے مرے دوست! میرا نام نہ پوچھ
کہ فقط اک وہ دائمی ہستی
جو ہر انسان سے شناسا ہے
اُس کے آغاز سے کرے ہے شروع
یاد رکھے ہر اک کو آخر تک

سخن کا دوام

کوی کے ذہن پہ اُتری نہ شعر کی دیوی
زمیں کو آج گھمایا نہ اُس کے ہاتھوں نے
مگر سنے تھے جو روحوں نے کل حسین سے گیت
ابھی بھی اُن کو تواتر سے گا رہی ہیں وہ

غلام مرتضیٰ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ان سرابوں میں کہاں پانی تھا
موجۂ ریگِ رواں پانی تھا

وہ گرمی کا موسم

کڑاکے کی گرمی، میں وہ دوپہر کو
گھروں سے نکلنا، وہ چھوٹوں بڑوں کا
وہ دریا کنارے، سبھی کے گزارے
درختوں کی چھاؤں، وہ یاد آئے گاؤں
وہ دریا میں کرنا، وہ تربوز ٹھنڈے
بہت بھوک لگنا، سبھی دن نہانا
وہ ڈبکی لگانا، مہِ جون میں بھی
وہ سردی کا لگنا، وہ اور ریت تپتی
بدن پر وہ مَلنا، بڑا لطف آنا
تمہیں یاد ہوگا، تمہیں یاد ہوگا
وہ بچپن لڑکپن، مزے دار دن تھے
اگرچہ کمی تھی، مگر بے غمی تھی
نہیں بھولتے اب، بھلانا بھی چاہوں
بھلانا بھی چاہوں، سبھی وہ گزارے
تو کب بھول پاؤں، میں عاصم بخاری

عاصم بخاری

موت

کوئی پرندہ بھی
میرے آنگن میں جب نہ آیا
میرے درختوں پہ پھل نہ آیا
تمہارے لہجے، تمہارے لفظوں سے
میرے سینے پہ زخم آیا
میں مسکرایا
میری اداسی کا
کوئی حل جب نظر نہ آیا
تو اپنے اندر گھٹن کے
بڑھنے سے یاد آیا
میں مر گیا تھا
اس ایک پل میں ہی
مر گیا تھا
جس ایک پل میں
تمہاری آنکھوں میں اشک آیا

سید تیمور کاظمی

اذیت ناک خودکلامی

خود کو رکھا تھا اُن کتابوں میں
رات دن اضطرابی حالت میں
خود کو ڈھونڈہ ہے اُن کتابوں میں
دھول سے اٹ گئی ہتھیلی بھی
میں مگر مل نہیں سکا خود کو
ڈائری کر رہی ہے سرگوشی
جس ورق پر حساب لکھا ہے
اس ورق پر تو شعر لکھے تھے
آج سبزی کے ساتھ دال بھی ہے
دلیا کل تھا سو دلیا آج بھی ہے
ایک بچے کی فیس دینی ہے
کوئی ٹافی غبارہ جوس نہیں
بچے حسرت سے دیکھتے ہیں مجھے
ڈیڑھ سو کم ہوئے ہیں سودے میں
دل ہی دل میں حساب کرتا ہوں

ڈائری کر رہی ہے سرگوشی
ریزہ ریزہ کہیں کہیں ہوں میں
جس ورق پر حساب لکھا ہے
اس ورق پر تو شعر لکھے تھے

اعجاز رضوی

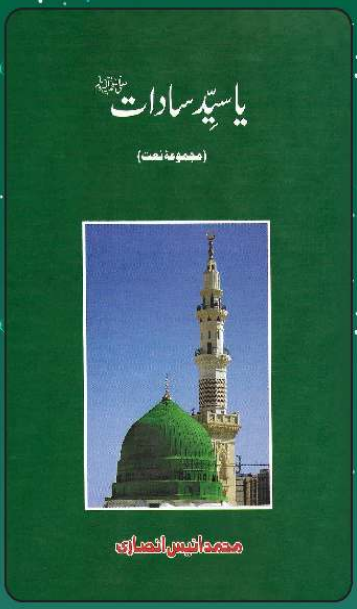

بس ایک محبت ہے
(شعری مجموعہ)
سیّد ضیاء حُسین

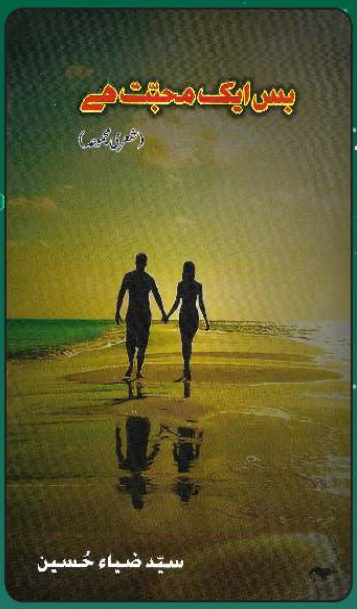

یا سیّدِ سادات ﷺ
(مجموعۂ نعت)
محمد انیس انصاری

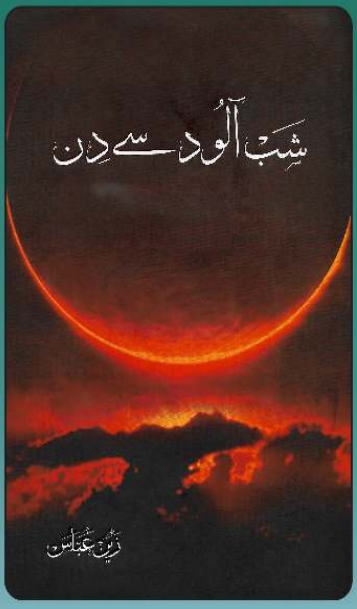

آئینوں کے شہر میں
ریاض ندیم نیازی

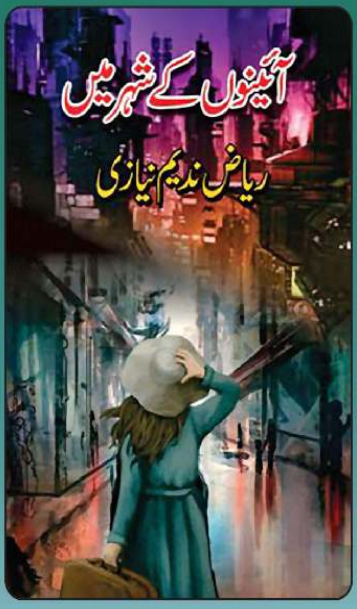

شبِ آلود سے دن
زین عباس

جناب خالد احمد، جناب حفیظ تائب، جناب زاہد مسعود، جناب سعید اقبال سعدی

محترمہ نیلم احمد بشیر، جناب خالد احمد، جناب سعد اللہ شاہ

جناب سرفراز علی حسین، جناب محمد شفیق، جناب خالد احمد، جناب نجیب احمد، جناب خواجہ محمد زکریا، جناب سعد اللہ شاہ
جناب محمد جمیل، جناب قائم نقوی، جناب نعمان منظور، جناب ارشد شاہین، جناب سرور حسین نقشبندی